Done

آصف

مخصوص کامد
مصنف ״
عنوان ״
ترتیب ״
مذہب - تاریخ

مذہب

نیاز فتحپوری

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

حضرت نیاز کی دوسری تصانیف

نگار بُک ایجنسی لکھنؤ

عرضِ نیاز

جنگ کے دو طریقے ہیں ایک جارحانہ، دوسرا مدافعانہ، لیکن ہمارے علماء کرام جب جنگ کرتے ہیں تو ان کی یہ جنگ جارحانہ ہوتی ہے نہ مدافعانہ، بلکہ صرف "بدکلامانہ" نہ خود انکے بتائے ہوئے مذہب کی تعمیر اتنی استوار کہ دشمن کے حملوں کو روک سکے اور نہ ایسے اسباب و ذرایع فراہم کہ فریق ثانی کے حملوں کا معقول جواب دے سکیں۔

وہ حریف کے اعتراضات سُن کر بلبلا تو اُٹھتے ہیں لیکن چونکہ "جرح و دفاع" دونوں حیثیتوں سے اپنے آپ کو کمزور پاتے ہیں، اس لئے بدکلامی اور سب و شتم کے سوا وہ کچھ نہیں کرسکتے اور اس کا نام انھوں نے "خدمتِ دین و مذہب" رکھا ہے۔

اس "جہاد فی الاسلام" کے سلسلہ میں یونہی متعدد علماء کا نام لیا جاتا ہے لیکن عبدالماجد دریابادی ان سب میں پیش پیش نظر آتے ہیں جو پہلے اخبار "سچ" اور اب "صدق" کے ذریعہ سے اس خدمت حقّہ کو انجام دے رہے ہیں۔

انھوں نے جس چیز کے خلاف یہ محاذ قایم کیا ہے اس کا نام انھوں نے "دہریت" "لامذہبیت" اور اس سے زیادہ جامع اصطلاح میں "یاجوجی قوت" رکھا ہے لیکن آج تک انھوں نے اس کا کوئی خاص مفہوم ہمارے سامنے پیش نہیں کیا۔

اگر جناب عبدالماجد صاحب کی مراد اس سے دنیا کی تمام وہ آبادی ہے جو مسلمان کے لقب سے یاد نہیں کی جا سکتی یعنی اگر "دہریت و لامذہبیت" سے ان کا مقصود صرف "لا اسلامیت و غیر مسلمیت" ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں، بہت پرانی چیز ہے اور عہد رسالت میں اب سے کہیں زیادہ پائی جاتی تھی، کیونکہ مسلمانوں کی تعداد اُس وقت بہت کم تھی اور اب اس سے بدرجہا زائد ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد ان کی دنیا کا وہ موجودہ میلان ہے جس نے نہ صرف مذہب اسلام بلکہ تمام مذاہب کی طرف سے انسان کو بے پروا و مستغنی بنا دیا ہے تو یہ درد ایسا معمولی نہیں ہے کہ اس کا علاج اس کو صرف "یاجوجی قوت" کہہ کہکر بُرا کہنے یا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر بد دعا دینے سے ہو سکے۔ سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ ارتقاء مذاہب کا فلسفہ کیا ہے، ترقی تہذیب و تمدن کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے، عہد حاضر کی ذہنیت کا ساتھ دینے کے لئے مذہب کس حد تک آمادہ ہو سکتا ہے اور یہ کہ اگر مذہب کی ضرورت اب بھی باقی ہے تو کیوں؟

میں عبدالماجد صاحب دریاآبادی کو نہایت ہی راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتا ہوں لیکن صرف "اشداء علی الکفار" کی حد تک ممکن ہے "رحماء بینھم" کا بھی کوئی قابل ذکر واقعہ ان کی مذہبی، سیاسی اور انسانی زندگی میں پایا جاتا ہو لیکن کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے ان کی حیات کا سب سے زیادہ عظیم الشان تبلیغی یا مذہبی کارنامہ اخبار سچ و صدق کا اجراء ہے، لیکن انھوں نے اپنی ساری عمر اسی تنقیص میں بسر کر دی کہ مغرب میں اس قدر شراب پی جاتی ہے۔ اس حد تک قمار بازی ہوتی ہے، اتنے جرائم ہوتے ہیں، یہ اعداد و شمار مظالم کے ہیں اور اتنی بے حیائیاں موجودہ تہذیب و تمدن میں پائی جاتی ہیں انھوں نے

کبھی اس امر پر غور نہیں کیا کہ دوسروں کے نقائص کے اظہار سے اپنی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان ذمیم حرکات کے برے نتائج دکھا کر احتراز کی تعلیم دی جائے، تو اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ جس قوم کی برائیاں کی جاتی ہیں ان کے محاسن بھی پیش کئے جائیں اور ان کے اختیار کرنے کی تعلیم دیجائے بہرحال عبدالماجد صاحب نے دوسروں کی بینائی کا نقص تو ضرور ظاہر کیا لیکن اپنی آنکھ کے شہتیر کی طرف کبھی نگاہ نہیں کی اور اسی لئے اس میں بجائے مصلحانہ رنگ ہونے کے ہمیشہ جارحانہ کیفیت پائی گئی اور عام طور پر یہی ہوتا بھی ہے کہ انتہائی مجبوری وبیکسی میں زبان پر گالیاں ہی آتی ہیں اور انھیں سے کمزور فطرت انسانی اپنی تسکین کرلیا کرتی ہے۔

میں جناب عبدالماجد صاحب کے جوش مذہبی اور خلوص نیت کا معترف ہوں لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جو طریق کار انھوں نے اختیار کیا ہے وہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بالکل نادرست ہے اور جن خیالات کے تحت انھوں نے تبلیغ کی وہ بڑی حد تک تنگ وپست ہے۔ ان کو سب سے پہلے غور کرنا چاہئے کہ اسلام کا حقیقی مشن کیا تھا اور عہد حاضر کے مبلغین کس طرح اسے پیش کر رہے ہیں اور اب جبکہ علوم وفنون کی ترقی نے تمام دنیا کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرکے مذہب کی ضرورت کو بالائے طاق رکھدیا ہے کیونکر انھیں اس طرف مایل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یورپ کی بادہ خواریوں کے افسانے تو بیان کئے۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ مسلمانوں کے بہے ہوئے بہک جانے کا کیا سبب ہے۔ انھوں نے مغرب کی تمام اخلاق شکن روایات کے ظاہر کرنے میں تو سارا زور قلم صرف کردیا۔

لیکن خود اپنے اخلاق کے اسباب خرابی متعین کرنے کی جرائت کبھی انھوں نے نہیں کی۔ انھوں نے تمام یوروپ کو تو معصیت کدہ سمجھ کر سب وشتم کا بازار گرم کردیا، لیکن اپنے ہاں کے اکابر ملت کے خلوت کدوں کا ذکر کبھی نہیں کیا، جن کی طہارت وعصمت کی داستانیں اور جن کی قدوسیت وللہیت کے افسانے یوروپ کے بڑے سے بڑے "عشرت کدہ" کو منفعل کرسکتے ہیں۔ جناب عبدالماجد صاحب کی طرح میں بھی اسی امر کا خواہش مند ہوں کہ یہ قوم ترقی کرے، اس کے اخلاق درست ہوں، اور موعودہ خلافت ارض اس کے ہاتھ آئے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اپنا وقت محض اس سعی میں صرف کرتے ہیں کہ دوسروں کے معائب کو ظاہر کرکے اپنے نقائص کو بیکار ثابت کیا جائے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ احتساب گھر ہی سے شروع ہو اور سب سے پہلے "غریب خانہ" ہی کو دیکھا جائے کہ اس کے "مشرق" میں کتنا "مغرب" چھپا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جرائت اخلاق جو غیروں کے اصلاح میں صرف کی جاتی ہے اس سے خود اپنی ہی جماعت کی تہذیب کا کام کیوں نہیں لیا جاتا اور وہ قوت احتساب جو تمام اقطاع مغرب کے حالات کو محیط ہے۔ وہ خود اپنے اور اپنی جماعت پر کیوں صرف نہیں کی جاتی۔

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دلربا ادائیں

جناب دریابادی خلافت کمیٹی میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے جمعیۃ العلماء کی مجلس میں بھی ان کو کافی درخور حاصل تھا۔ کانگریسی خیال کے لوگوں میں بھی وہ نامقبول نہیں تھے، اُس انجمن کے بھی وہ رکن تھے، جس نے لامذہبیت و دہریت کا مقابلہ کرنے

کے لئے فرنگی محل کے منبر و محراب میں انگڑائی لی تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے آپ کو آزاد خیال، آزاد مقال، نقاد مذہب و دین بھی سمجھتے ہیں۔ اس لئے کیا ان کی ان تمام حیثیات بلند کو سامنے رکھتے ہوئے، ہمیں حیرت نہ کرنا چاہئے کہ انھوں نے کبھی نہ جمعیتہ العلماء کے ارکان کو ان کو فرض شناسی کی طرف توجہ دلائی نہ کانگرس کے مطمح نظر کو سامنے رکھ کر انھوں نے عملی قدم اُٹھایا اور نہ کبھی اس امر کی جستجو کی کہ دنیا میں لامذہبیت کیوں پھیلتی جا رہی ہے، اور کیا ان تمام خرابیوں کا علاج سوائے یورپ کے بُرا کہنے کے اور کچھ نہیں۔

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے وہ نابلد نہ ہوں گے، وہ اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ایک مصلح یا پیغمبر کی مسجع و مقفےٰ گفتگو کو کبھی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ نہیں سمجھا گیا وہ جانتے ہوں گے کہ سکندر کی فتوحات پاؤں توڑ کر مقدونیہ میں بیٹھے رہنے سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اور وہ اس سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ اکاسرۂ عجم کی قوت صرف وعظ و تلقین سے پارہ پارہ نہیں ہوئی اور بہ حیثیت ایک صوفی انسان ہونے کے اُن سے زیادہ کون اس حقیقت کا رمز شناس ہو سکتا ہے کہ :۔

رہرو کعبہ بشارت ز قبولش نہ دہند

جز بداں خار کہ از بادیہ در پا ماند

اس لئے وہ کون چیز ہے جو میدان عمل میں قدم اُٹھانے سے انھیں باز رکھتی ہے اور اس کانٹے کے چبھنے سے کیوں ان کے پاؤں میں کپکپی پیدا ہوتی ہے جس کی خلش حاصل

کئے بغیر منزل تک پہونچنا محال ہے۔ وہ کیوں اپنی قوتِ احتساب سے اس جماعت کو ختم کر دینے کا کام نہیں لیتے۔ جس کے طویل جبہ وعمامہ میں قوم کی تباہیوں کے جراثیم اور اخلاق کی بربادیوں کے اسباب ہزار اندر ہزار پنہاں ہیں۔ اور وہ سب سے پہلے ان "علمائے کرام" اور "مولویان عظام" کو صفحۂ زمین سے محو کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، جنھوں نے اپنے اعمال رویہ اور افعال سخیف سے عالم اخلاق کو سوگوار اور دنیائے نہضت وعمل کو حزین وملول بنا رکھا ہے۔ وہ اب اس حد سے گزر گئے ہیں کہ ان کی اصلاح ہو سکے ان کی ذہنیت کی پستی اب کبھی اس بلندی کی طرف نہیں آسکتی جو کسی وقت اسلام کی خصوصیت خاصہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ ہماری جماعت کا ایک ایسا عضو ماؤف ہیں جس کا قطع کر دینا ہی تنہا علاج ہے، اس لئے اب اگر کوئی سعی کامیاب ہو سکتی ہے تو صرف اسی صورت سے کہ پہلے اس جماعت کو منہدم کیا جائے، راہ کو اس خارزار سے صاف کیا جائے اور بالکل جدید اُصول سے از سر نو اُس درس کی یاد تازہ کی جائے جو ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے یکساں مشعل راہ ہو سکتا ہے اور وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے لب ولہجہ اور طریق استدلال میں تبدیلی پیدا کی جائے اور اس طرح اس لچک کو قائم رکھا جائے جو ایک فطری مذہب میں ہونا چاہئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ماجد بھی میری ہی طرح

"ہر چہ بینند بعنوان تماشا بینند"

اور مجھ میں ان میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ میں

"بہ من شراب وبہ زاہد مژدۂ تسنیم"

کی تقسیم پر قانع نظر آتا ہوں اور وہ غریب اس لطف سے بھی محروم ہیں۔

میرے اس مقالہ کا مقصود صرف یہ ہے کہ میں خود اس کی صراحت کروں کہ عبدالماجد صاحب کی بتائی ہوئی "باجوجی قوت" کیا ہے اور اس کا سراغ ہمیں کس جگہ مل سکتا ہے۔

میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے مذہب کے فلسفہ و ارتقاء پر گفتگو کروں گا، پھر مذہب سے بغاوت کے اسباب سامنے لاؤں گا اور اخیر میں یہ بتاؤں گا کہ مذاہب کا مستقبل کیا ہے اور اگر کوئی مذہب اب زندہ رہ سکتا ہے تو کس طرح ؟

نیاز

پہلا باب

تاریخ مذہب

طبقات الارض و فلکیات کے ماہرین کا قول ہے کہ دنیا کروروں برس کی عمر رکھتی ہے، یعنی اس کی موجودہ حالت کروروں برس کے تدریجی ارتقاء اور تغیر و تبدل کے بعد قایم ہوئی ہے۔ ہرچند یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کا وجود روئے زمین پر کب سے پایا جاتا ہے، لیکن بعض ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ کم ازکم پچاس لاکھ سال ہوئے جب اول اول انسان کا ظہور ہوا اور غالباً اسی وقت سے مذہب کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ ہرچند انسان نے اپنے خیالات و تجربات کو تحریر میں لانا صرف پانچ چھ ہزار سال سے شروع کیا ہے اور قدیم زمانہ کی جو روایات اس نے قلمبند کی ہیں وہ خرافیات کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں، لیکن انسان کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام و ملل کی رفتار میدان ارتقاء میں یکساں نہیں رہی اور ماحول کا اثر اس پر برابر پڑتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قومیں مدارج ارتقاء طے کر کے جلد معراج ترقی تک پہونچ گئیں اور بعض قومیں ابھی تک ظلمت و تاریکی کے دور میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بہر حال ہمیں اقوام عالم کی صحیح تاریخ کا علم ہو یا نہ ہو لیکن

فطرت انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ حکم آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ مذہب انسان کی زندگی کے ساتھ پیدا ہوا اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ لیکن زمانہ و ماحول کے لحاظ سے جو اثر اس پر ہوتا ہے اس کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کا مذہب ابتدا میں کیا تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہوگیا اس مقصد کے لئے ہم اقوام عالم کی دو تقسیمیں کرتے ہیں ایک وہ مدارج جو ارتقا طے کرتے کرتے متمدن و مہذب ہوگئیں دوسری وہ جو ہنوز غیر متمدن اور وحشی ہیں۔

تخلیق مذہب

جب ذہن انسانی کا ابتدائی دور ختم ہوا اور اس میں سوچنے کی کیفیت پیدا ہوئی تو سب سے پہلے اس کی توجہ اپنے جسم کے سایہ کی طرف منعطف ہوئی اور عدم پختگی عقل کی وجہ سے اس نے اس سایہ کو خود اپنا ہی ایک جزو یا زندہ "مثنی" سمجھا، اسی کے ساتھ اس کے خیال میں یہ بھی آیا کہ جب وہ سوتا ہے تو شاید اس کا سایہ ہی ہے جو دنیا بھر کی سیر کرتا ہے اور رات کو جب چاروں طرف تاریکی چھا جاتی ہے تو شاید یہ روحیں ہیں جن سے سائیں سائیں کی آواز آتی رہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان روحوں کی صفات کا خیال بھی دل میں پیدا ہوا اور موزی روحوں سے خوف و وحشت اور شفیق روحوں سے محبت کا اظہار کرنے لگا اور یہ تھی اولین بنیاد مذہب کی۔

پرستش

ابتدائے آفرینش میں انسان بحالت اشتراکیت رہا کرتا تھا اور دنیا کی کوئی چیز کسی شخص کی خاص ملکیت نہ سمجھی جاتی تھی سب ملکر

زندگی بسر کرتے تھے لیکن ہمیشہ یہ حالت قایم نہیں رہی اور بعد کو طاقتور نے کمزور کو دبانا شروع کیا اور "ادارۂ حقوق و ملکیت" قایم ہوکر رفتہ رفتہ، سردار، راجہ و فرمانروا کا وجود عمل میں آیا۔ لیکن سرداری یا فرمانروائی صرف اسی دنیا تک محدود نہیں سمجھی گئی بلکہ اس کے مرجانے پر بھی وہی احترام قایم رہا اور اسے دیوتا سمجھنے لگے یعنی اسی طرح دنیا میں زندہ بادشاہ کی فرمانبرداری اور مردہ بادشاہ کی پرستاری کا سلسلہ جاری ہوگیا جسے "عبادت و پرستش" کی ابتدا کہنا چاہئیے۔

بہشت و دوزخ اس کے بعد انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کہاں جاتی ہے؟ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ وہ تاریک جنگلوں میں یا نظروں سے دور کسی مقام میں رہتی ہے، لیکن جب جنگلوں میں چلنے پھرنے سے کبھی کسی روح سے ملاقات نہ ہوئی تو یہ خیال ہوا کہ وہ یا تو برف پوش پہاڑوں پر رہتی ہے، یا زمین کے نیچے کسی مقام پر چلی جاتی ہے اور یہیں سے سورگ و پاتال، بہشت و دوزخ، علیین و سجین وغیرہ کی روایات پیدا ہوئیں۔

مقتدایان دین ارتقاء تمدن کے ساتھ ساتھ جب انسان نے خانہ بدوشی چھوڑ کر ایک جگہ اقامت اختیار کی اور زراعت و فلاحت میں مصروف ہوگیا تو اس نے اپنے مختلف اغراض و مشاغل کے لحاظ سے مختلف دیوتا بنائے انسان قدیم سمجھتا تھا کہ اس کی صحت و بیماری، زراعت و شکار۔ اور تمام مقاصد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار انھیں دیوتاؤں کی خوشنودی یا برہمی پر ہے اور اسی لئے وہ پوجا پاٹ یا پرستش و نمایش کو بہت اہمیت دینے لگا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ دیوتا بھی انسان کی طرح

الحاح وزاری سے خوش ہوتے ہیں اور اگر خوشامد کی جائے تو برہم ہو جاتے ہیں چنانچہ پرستش کے خاص مراسم قایم ہوئے اور جن لوگوں نے ان مراسم کے ادا کرنے میں مہارت حاصل کی، ان سے لوگ اپنی عبادت میں مشورہ لینے لگے اور ان کی خدمت کے بدلے میں کچھ نذرانہ بھی دیا جانے لگا۔ اسی طرح پنڈتوں، پجاریوں، ملاؤں، وسقفوں، موبدوں، بھکشوؤں، پادریوں وغیرہ کی ابتدا ہوئی۔

مگر چونکہ درحقیقت اغراض و مقاصد میں کامیابی کا انحصار بھوتوں یا ارواح کی مدد پر نہیں ہے اس لئے جب کبھی عبادت کرنے کے بعد بھی کسی شخص کا مقصد حاصل نہ ہوتا تھا تو وہ اپنے پجاری یا مقتدائے دین سے شکایت کرتا تھا اور وہ اپنا اعتبار و اعتماد قایم رکھنے کے لئے ادھر اُدھر کی باتیں بنا کر ناکامی کی توجیہہ کرنا شروع کر دیتا تھا۔ یہ تھی ابتدا اس جھوٹ کی جو سب سے پہلے ارباب مذہب کی طرف سے بولا گیا اور جس نے آگے چل کر تمام دُنیا کو مکر و فریب میں مبتلا کر دیا۔

بُت پرستی

ارتقاء تمدن کے ساتھ انسان کے خیالات میں بھی ترقی ہوئی، وہ دُنیا کی چیزوں کو دیکھتا تھا، ان پر غور کرتا تھا، وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ طوفان کیوں آتا ہے؟ دریا کیوں بہتا ہے؟ بادل کیوں گرجتا ہے۔ بارش کیوں ہوتی ہے؟ شیر و نہنگ اس قدر طاقتور و موذی کیوں ہیں؟ نباتات ہر سال از سر نو کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس کے ذہن کی طرف سے یہ ملتا تھا کہ یہ سب ارواح کے کرشمے ہیں، چنانچہ ہر بات کے لئے ایک بُت قایم کر دیا گیا اور پوجا ہونے لگی۔

قاعدہ ہے کہ چھوٹی بات سے بڑی بات پیدا ہوتی ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی

ارواح کا خیال آیا تو اس کے بعد قدرت کی بڑی بڑی باتوں کا خیال آنا ضرور تھا، اس لئے سورج، چاند، ستارے، آسمان، زمین، بارش، بجلی، رعد وغیرہ کو بڑے بڑے دیوتاؤں سے منسوب کر کے ان کے ہیکل قایم کئے گئے اور اس طرح دنیا میں بت پرستی کی ابتدا ہوئی۔

توحید

جس طرح ایک قبیلہ دوسرے کو مغلوب کر کے طاقتور ہو جاتا تھا، اسی طرح بعد کو جب ایک بادشاہ نے دوسرے فرمانرواؤں کو مغلوب کر کے اپنا تابع بنا لیا اور شہنشاہ ہو گیا تو انسان کا خیال دنیائے پرستش میں بھی انہیں اصول پر کاربند ہوا اور اس نے سمجھا کہ دیوتاؤں میں بھی کسی ایک دیوتا کو سب پر غالب آنا چاہئے اور اس طرح سب سے پہلے توحید کی بنیاد انسان کے دل میں پڑی۔

الحاد

لیکن انسان کے دماغ کو قرار نہیں۔ جوں جوں عقل میں پختگی آتی گئی، خیالات میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ قصبوں اور شہروں کی بنیاد پڑی، کتابیں لکھی جانے لگیں۔ وسعت خیالات کے ساتھ عقائد پر مناظرے شروع ہو گئے۔ جن امور کا منصرم بتوں یا دیوتاؤں کو سمجھا جاتا تھا ان کے اسباب و علل کچھ اور نکل آئے۔ کہیں گیس کا کرشمہ نظر آیا۔ کہیں برق و بخار کا عمل اور اسی طرح تمام حوادث قدرت کی توجیہیں ہونے لگیں، یہ تھا پہلا صدمہ جو مذہب کو اب سے دو تین ہزار سال قبل پہونچا اور جسے دنیا الحاد سے تعبیر کرنے لگی۔

مذاہب لااخلاق

یہ حال ان مذاہب کا تھا جنہیں "مذاہب فطرۃ" کہتے ہیں۔ لیکن بالکل اسی طرح سے ابتدا و ارتقاء ان مذاہب کی بھی

ہوئی ہے جنھیں "مذاہب اخلاقی" کہتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ مقتدایان مذہب اول اول اسی امر پر زور دیتے رہے کہ دیوتاؤں کی پوجا کرو، بھینٹ چڑھاؤ، قربانیاں کرو اور پجاریوں سے مدد لے کر ان کو نذر دو۔ جب رفتہ رفتہ ان میں تعلیم بڑھی تو انھوں نے انسان کی اہلی زندگی پر بھی اقتدار قایم کرلیا اور معیشت و معاشرت کے آئین و قوانین بناکر انھیں دیوتاؤں سے منسوب کیا۔ یہ تھی بنیاد مذہب اخلاق کی۔

کتب مقدسہ

اول اول پوجا پاٹ کی رسمیں بطور اسرار سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں، لیکن بعد کو انسان نے حروف ایجاد کئے اور وہ لکھنے پڑھنے لگا تو مقتدایان دین نے ان ابتدائی اعتقادات اور قدیم رسموں کو مدوّن کرنا کرنا شروع کیا اور چونکہ حافظہ زیادہ کام نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے سُنی سُنائی باتوں سے ان کتابوں کو بھر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اپنی قوم کی عظمت و شان بھی بیان کی۔ پُرانے بادشاہوں اور قوموں کے کچھ قصّے بھی داخل کئے اپنے معبود کو تمام معبودان عالم سے غالب قرار دیا۔ اور اپنی قوم کو خیر الامم ظاہر کیا۔ اُنھوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان کا مذہب ابتدائے آفرینش سے اسی طرح چلا آتا ہے۔ اور ہر جگہ اپنے خدا کی بزرگی اور جلال کا اظہار کیا۔

اب چونکہ احیاء علوم و فنون کا زمانہ ہے، تمام باتیں سائنس کی روشنی میں دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے ماہرین فن نے علم "معیار المذاہب" اور علم "تقابل المذاہب" بھی ایجاد کیا جس سے مختلف مذاہب کو بالمقابل رکھ کر جانچا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ماہرین آثار قدیمہ نے تمدن قدیم کے وہ تمام خزائن برآمد کرلئے جن کے ذریعہ

سے کتب مقدسہ کے بیانات کی بخوبی جانچ کی جا سکتی ہے۔

قدیم مذاہب در اصل مظاہر قدرت کے متعلق جاہل اقوام و ملل کی سیدھی سادی خیال آرائی سے زیادہ کوئی چیز نہ تھے۔ لیکن جب بعد کو ان میں کچھ علمی تاویلیں اور اخلاقی اصول شامل ہو گئے تو مقتدایان دین یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ انکا مذہب الہامی ہے، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مذہب دوسرے کا مضحکہ اڑانے لگا کیونکہ مذہب کا صحیح علم صرف طبقۂ علماء تک محدود رہا۔ اور عوام کو اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ تاہم تقابل مذاہب سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب دوسروں سے نسبتاً اعلیٰ ہیں

مذاہب تاریخی

موجودہ تہذیب و تمدن کا آغاز اب سے پانچ چھ ہزار سال بیشتر ہوا لیکن اس کی ابتدا ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ ہوئی۔ سب سے پہلے تمدن کی ابتدا کریٹ مصر اور عراق میں ہوئی، یہ تینوں ملک قریب قریب واقع ہیں (اب سے پانچ چھ ہزار قبل سرزمین کریٹ علاحدہ جزیرہ نہیں تھی، بلکہ مغربی ایشیا کا ایک حصہ تھی) الغرض ان تینوں ملک نے اپنا اپنا تمدن تقریباً ایک ہی ساتھ شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار تصویروں کے ذریعہ سے کرنے لگے جسے "خط صوری" کہتے ہیں۔

کریٹ

کریٹ (Crete) کا تمدن بھی اسی قدر اعلیٰ تھا۔ جیسا مصر کا اور ہر چند ابھی تک وہاں کی قدیم زبان پر عبور حاصل نہیں ہوا لیکن وہاں کے آثار قدیمہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کوئی "مذکر دیوتا" نہیں تھا۔ صرف ایک "دیوی" کی پرستش ہوتی تھی، اور اس دیوی کی چھاتیاں بہت بڑی بڑی بنائی جاتی تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دیبی دراصل "دھرتی ماتا" تھی گویا اہل کریٹ کا مذہب اس دور سے آگے نہیں بڑھا تھا جب صرف مظاہر قدرت کی پرستش کی جاتی تھی۔

مصر مصر قدیم کا مذہب بھی اہل کریٹ ہی کے مذہب سے ملتا جلتا ہے ہرچند دونوں کے معتقدات مذہب اور مذہبی رسوم میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ یعنی اگر کریٹ میں صرف ایک "دیوی" تھی تو مصر میں دیوتاؤں اور دیویوں کی خاصی فوج موجود تھی، اور ان دیوتاؤں اور دیویوں کے پجاری بھی مختلف تھے۔ ان لوگوں میں حیات عقبیٰ کا وہی عقیدہ موجود تھا جو آج کل مسیحیت یا اسلام میں نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا "ہمزاد" حنوط شدہ لاش کے ساتھ قبر میں رہتا ہے اور اس کی روح جزا و سزا کے لئے خداوند اسیریز (OSIRIS) کے پاس چلی جاتی ہے۔ جو عالم ارواح کا بادشاہ ہے۔ اگر اس روح کی بداعمالیاں نیکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں تو وہ روح تباہ یا فنا کردی جاتی ہے۔ اگر روح کی نیکیاں اس کی بداعمالیوں سے زیادہ ہیں تو اسے "مسرت ابدی" کی نعمت بخش دیجاتی ہے۔

مصری مذہب کے متعلق سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں جانور کا سا سر رکھنے والے دیوتاؤں کی بڑی تعداد موجود ہے حالانکہ جس قوم کا تمدن اس قدر اعلیٰ رہا ہو اس کو ایسے عجیب الخلقت خداؤں کے سامنے سر جھکانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ لیکن مطالعۂ مصریات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر کا صرف طبقۂ جہلا ایسے دیوتاؤں کا معتقد تھا اور تعلیم یافتہ جوان دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا تھا۔ پجاریوں کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے مختلف دیوتا بنالئے تھے۔ جن پر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ علاوہ اس کے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

"وادی النیل" میں مختلف قومیں مختلف ممالک سے آکر آباد ہوئی تھیں اور اس لئے ان دیوتاؤں کو مختلف ہونا چاہئے تھا۔ کسی قوم کا خدا سورج تھا، کسی کا چاند، کسی کا عقاب کسی کا گھڑیال، کسی کا بیل اور کسی کا بندر[1] ان مختلف دیوتاؤں کے پجاری مدتوں تک خانہ جنگی میں مبتلا رہے اور آخر کار صدیوں کی لڑائی کے بعد مسیح سے چودہ سو برس قبل ان تمام اقوام کو ایک بادشاہ نے فتح کرکے انھیں پوری طرح منظم کیا اور ایک قوم بنادیا۔ یہ بادشاہ امان حاطب رابع (Amen Hatab IV) تھا۔ اس بادشاہ نے نہ صرف یہ کیا کہ مصریوں کو ایک قوم بنادیا۔ بلکہ ملک میں ایک خالص روحانی مذہب بھی قایم کیا جو بڑی حد تک توحید کا درس دیتا تھا۔

بابل اب سے تقریباً پانچ چھ ہزار قبل وادی فرات کے مختلف علاقوں میں طوائف الملوکی قایم تھی۔ جگہ جگہ بہت سے آزاد شہر آباد تھے اور ہر شہر ایک جداگانہ خود مختار ریاست تھا۔ جس میں حکومت مقتدایان دین کی تھی۔ اگرچہ بابل کی تاریخ بہت طویل ہے۔ لیکن اس قدر بتادینا کافی ہوگا کہ تمام ملک میں دو قومیں پورے اختلاط و ارتباط کے ساتھ بستی تھیں۔ ان میں ایک قوم ساری (Samerian) اور

---

[1] بعض قدیم مصری دیوتاؤں کے نام یہ ہیں:- اوسیریز (Osiris) مالک یوم الدین، رع (Ra) "سورج" ہورس (Horus) "نجات دہندہ"، آئیسز (Isis) افزائش نسل و زراعت کی دیوی نیت (Nit) دولت خوشحالی کی دیوی آتور (Athor) گاؤ سر دیبی یا دھرتی ماتا۔ انوبیس (Anubis) سگ سر دیوتا۔ محافظ قبرستان۔

دوسری سامی یا سماتیقی (Semitic) تھی اور یہ دونوں قومیں شیر و شکر کی طرح ملی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ دونوں قوموں نے اپنے معبود بھی شامل کر لئے تھے۔ یہ لوگ کسی "حیوان پیکر" دیوتا کے پرستار نہیں تھے۔ لیکن جب کامیاب پجاریوں نے اپنے دیوتاؤں کی عظمت و جلال کو فروغ دیا تو بہت سے چھوٹے چھوٹے دیوتا بن گئے۔ سامریوں کے دیوتاؤں میں بڑے بڑے دیوتا سنو و بعل (Sanu & Baal) خدائے آسمان یا دھرتی ماتا)، سن (Sin) چندرماں نوسکو (Nuska) اگنی وغیرہ تھے۔

اور سامیوں کے بڑے دیوتا اور دیویاں یہ تھیں :- شمس (Shams سورج) مردوق (Marduk) سورج اشتار (Ishtar) عشق و محبت اور جنگ و جدال کی دیوی تموز (Thammuz) اور افزائش نسل و فصل کا دیوتا۔

جب یہ تمام ریاستیں مل کر سلطنت بابل قایم ہوئی، اس وقت بھی مقتدایانِ دین کی خصومت بدستور پائی جاتی تھی۔ لیکن نہ اس قدر اور آخر کار وہاں کا مقامی خدا مردوق سب سے بڑا خدا بن بیٹھا جس کے بعد شمس کا دور دورہ ہوا۔

الغرض ارتقاء تمدن کے ساتھ تہذیب معتقدات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور دیوتاؤں کی شخصیت میں زیادہ تجرید اور روحانیت پیدا ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اشتار جو پہلے فسق و فجور کی دیوی تھی اور جس کے بھون میں "مقدس حرام کاری" ہوا کرتی تھی وہی درماندگی اور معصیت کی جائے پناہ اور زاہدانِ مرتاض کی سرپرست بن گئی۔

چین

یہ امر باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ ملک چین کی قدیم تہذیب و تمدن کا ابتدائی سرچشمہ مغربی ایشیا تھا۔ اسی لئے قدیم چین کا تمدن، بابل کے تمدن سے

لیکن محققین کا خیال ہے کہ اس کی عمر پانچ چھ ہزار سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ ہر چند چینیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کا تمدن کم از کم بیس ہزار سال کا ہے مانا جاتا تھا۔

قدیم چین کے مذہب کا حال ان مغلی قبائل کے معتقدات و رسوم سے معلوم ہو سکتا ہے جو حدود چین کے اندر یا ان سے متصل آباد تھے۔ یہ قومیں چکچی۔ یوقاغیر قریاق اور اینو تھیں چکچیوں کے نزدیک درخت، جنگل، جھیل، دریا وغیرہ ہر چیز کا ایک دیوتا تھا۔ جسے ان کی اصطلاح میں "آقا یا مالک" کہتے تھے۔ مرجانے والوں کی روحیں سعید ہوں یا خبیث زندہ سمجھی جاتی تھیں۔ خبیث ارواح کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ دیہات و ریگستان میں رہتی ہیں اور لوگوں کو ستاتی ہیں۔ انھیں وہ لوگ شیاطین کہتے تھے اور یہ ارواح خبیثہ لوگوں کو بہت ستاتی تھیں، اس لئے جھاڑ پھونک والوں کی بھی کثیر تعداد موجود تھی، جنھیں وہ لوگ "شمن" کہتے تھے۔

ان میں ایک بڑا دیوتا بھی تھا، جسے وہ اپنی زبان میں "جان بخش و آفریدگار" کہتے تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت نہیں کرتے تھے، ہندوؤں میں بھی "آفرینندہ" دیوتا برہما ہے۔ لیکن اس کی پرستش نہیں ہوتی، یوقاغیروں اور قریاقوں میں بھی ایک آسمانی خدا تھا اور ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر اس کے حضور میں جانوروں کی قربانی دینے میں کوتاہی کی جاتی ہے تو ناراض ہو کر سو جاتا ہے اور پھر دنیا میں "فساد" پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ ابتدائی حالت چین کے معتقدات کی۔

قدیم چینیوں کے مذہب میں عام دیوتاؤں کا سردار ایک "مہادیو" تھا

جسے وہ لوگ "شنگتی" (اعلیٰ آسمانی بادشاہ) یا "تین" (آسمان) کہتے تھے جو سب سے بلند مرتبہ کا معبود خیال کیا جاتا تھا۔ الغرض یہاں مسیح کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل ایک "آسمانی خدا" کا عقیدہ ضرور تھا، اگرچہ طبقۂ عوام و جہلا میں چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی بھی پرستش ہوتی تھی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں دولت چین پر ادبار و زوال کی گھٹائیں چھائیں اور ہر جگہ عالم فساد برپا ہو گیا۔ اس وقت ملک میں دو شخص ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے ملک کو ظلمت و جہالت سے نکالنا چاہا ایک کا نام لاؤتسا ( ) تھا اور دوسرے کا نام کانگفو(زے) (Cong fulse) یا کنفوشس یہ دونوں "لاادریت" (agnosticism) کے قایل تھے اور ان کے اثر سے تعلیم یافتہ چین اب سے اڑھائی ہزار سال پیشتر درجۂ "لاادریت" کو پہونچ گیا تھا۔ لاؤتسا نے جسے فارسی زبان میں "لوشا" کہتے ہیں۔ مذہب "تاؤیت" (Taoism) قایم کیا (لفظ تاؤ کے معنی چینی زبان میں صراط مستقیم کے ہیں) لیکن بعد میں یہ مذہب "بودیت" (Budhism) سے مل کر مجموعۂ اوہام ہو گیا۔

حکیم کنفوشا کی تعلیم بھی لاادریت پر مبنی ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ روحانی ہستیوں کا احترام کرتے ہوئے ان فرایض کو صحیح طور پر ادا کرے جو اس پر از روئے حقوق العباد عائد ہوتے ہیں روحانیات کے درپے ہونا مناسب نہیں۔ یہ مذہب صرف مجموعۂ ضوابط اخلاق ہے، جس پر

اڑھائی ہزار برس سے چین کا روشن خیال طبقہ عامل ہے۔

جاپان

جاپان کے تمدن و شائستگی میں چین کا اس قدر حصہ شامل ہے کہ جاپان کو اس سے علیحدہ سمجھنا فضول ہے۔ جاپان میں عوام کا مذہب شنتوئیت (Shinto ism) ہے جو چین کے مذہب تاؤئیت کا مترادف ہے۔ علاوہ ازیں چین کی طرح جاپان میں بھی بودھیت کے مراسم داخل مذہب ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مذہب شنتو میں ۸۰ لاکھ دیوتا ہیں۔ بودھیت کی طرح مذہب کنفوشا بھی جاپان میں چین سے آیا۔ اور قرنہا قرن سے تعلیم یافتہ جاپانی اسی مذہب کے اصول پر عامل ہیں۔

مذاہب الہند

مشہور ہے کہ برّ اعظم ہند میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں اتنے ہی مذہب بھی رائج ہیں۔ ایک طرف کوہستان نیل گری کے نیم وحشی ٹوڈے ہیں جو ارواح یا دیوتاؤں کے معتقد ہیں۔ دوسری طرف آریا ہیں جو خود کو خدا پرست کہتے ہیں ایک طرف وشنوئی ہیں جو رام اور کرشن اور وشنو کے اوتاروں کو مانتے ہیں دوسری طرف شیومت والے ہیں جو "لنگ اور یونی" یا "مہادیو اور پاربتی" کی پرستش میں اپنی فلاح و نجات سمجھتے ہیں، سنسکرت کی قدیم ادبیات اور مغربی ایشیا کے آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آریا قوم کا تعلق قدیم اقوام فرنگ سے عموماً اور ایرانیوں سے خصوصاً بہت زیادہ تھا اب سے تین ہزار تین سو برس قبل جب اہل میدیا (media) کو اپنی پڑوسی مغربی سلطنت سے شکست حاصل ہوئی تو ایک صلحنامہ لکھا گیا جسے ماہرین آثار قدیمہ نے برآمد

کرلیا ہے۔ اس معاہدہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل میدیا نے ایسے دیوتاؤں کو ضامن قرار دیکر دستخط کئے ہیں جو قدیم آریوں کے دیوتا تھے۔ مثلاً اندر، وَرُن، اگنی وغیرہ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل میدیا اور قدیم آریا قوم کا وہی مذہب رہا ہوگا جو قدیم ایرانیوں کا تھا۔

آریا قوم یا قدیم ہندؤں کے مذہب کا حال "ویدوں" سے معلوم ہوتا ہے لیکن ویدوں میں جو حالات اس قوم کے بتائے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم دماغی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھی۔ بہرحال محققین اور مستشرقین کی کاوش سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ قدیم ایرانیوں رومیوں سلافیوں توتانیوں (یعنی جرمن) کلٹون (Celts) اور آریاؤں کے مذاہب باہمدگر بہت تشابہ تھے۔

آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں اور قومیں بھی آباد تھیں جنھیں آجکل کے علماء "دراوڑی" اقوام (Dravidians) کہتے ہیں۔ یہ لوگ جب زرخیز میدانوں سے نکال دئے گئے تو وہ دور افتادہ کوہستانوں اور وادیوں میں جانب جنوب آباد ہوگئے۔ ان لوگوں کا مذہب اب بھی صرف مظاہر قدرت کے دیوتاؤں کی پرستش ہے۔ مشرقی ہند کی کھاسی قوم (Khasis) کا بھی یہی مذہب ہے اور یہی حال زمانہ قدیم میں تمام ممالک و اقوام کا تھا یعنی وہ معبودان فطرۃ (nature gods) کے پرستار تھے۔

آریا قوم اپنے ساتھ دوسرے دیوتا بھی لائی جو صفات میں قدیم دیوتاؤں سے افضل تھے۔ یہ دیوتا تین اقسام پر مشتمل ہیں۔

آسمانی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ اہم سوریہ یا سورج نارائن (یہی بابلیوں اور ساامیوں کا شمسائیل تھا۔ اشاس دیوی (صبح) یہ سوریہ کی ماں ہے) ہیں۔ فضائی دیوتاؤں میں سب سے بڑے اندر (بارش، رعد بجلی وغیرہ کا دیوتا۔ اسی کو عبرانیوں اور اسلامیوں کا میکائیل سمجھنا چاہئے اور ورون (ہوا کا دیوتا) ہیں۔ ارضی دیوتا میں سب سے بڑے اگنی (آگ کا دیوتا) اور پرتھوی (دھرتی ماتا) ہیں۔ اگر شمار کیا جائے تو قدیم ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوتا تھے۔ لیکن جب تمدن کے ساتھ دماغ میں پختگی آئی اور خیالات میں رفعت پیدا ہوئی تو چند خاص دیوتاؤں کو چھانٹ کر انھیں درجۂ الوہیت اور روحانیت دیدیا گیا۔

مسیح سے تقریباً آٹھ سو برس پیشتر برہمنوں نے جنھیں کھانے کمانے کی کوئی فکر نہ ہونے کے باعث بے حد فرصت تھی مظاہر قدرت پر تخئیل آرائی کرنی شروع کی اور ایک فلسفۂ مذہب بنام "ویدانت" ایجاد کیا۔ جس میں روح و مادہ اور اسباب و علل سے بحث کی گئی ہے لیکن چونکہ ہندو الٰہیات جمہور کی رسائی فہم سے بہت دور ہے۔ اس لئے عام ہندوؤں کا مذہب ابھی تک، وہی بُت پرستی چلا آتا ہے، جسے فلسفہ

ل قدیم یونانیوں میں جو دیوتا زیوس (Zeus) تھا وہی رومیوں میں جیوپتر (Jupiter) کہلایا اور قدیم ہندوؤں میں دیوس پتر (Dayuspitra) —— چینیوں میں یہی دیوتا شنگتی تھا جو غالباً سنسکرت کے لفظ "شکتی" کی چینی صورت ہے، شنگتی، طاقت۔ لہذا شنگتی علت العلل ہوا)

ویدانت سے کوئی تعلق نہیں۔ زمانۂ حال کے ہندوؤں میں ایک اور جماعت پیدا ہوئی ہے جو خود کو "آریہ" کہتی ہے ان کی تعلیمات میں وحدانیت کی جھلک بڑی حد تک نمودار ہے۔

مسیح سے چھ یا سات صدی قبل ہندو مذہب سے بودھ مذہب اور جین مت پیدا ہوئے جن کے بانی گوتم بدھ اور مہابیر تھے ان مصلحین نے فلسفۂ الٰہیات کو بالائے طاق رکھ کر لوگوں کو صرف تزکیۂ نفس اور حقوق العباد ادا کرنے کی تلقین کی۔ تمام کائنات کا مدار ان کے نزدیک کرم یعنی اعمال پر ہے۔ یہ لوگ دیوتاؤں اور خدا کی ہستی کے منکر ہیں۔ یہ گویا الحاد ہوا بو توحید کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

مذاہب امریکہ محققین آثار نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کولمبس کی آمد سے قبل جو لوگ امریکہ میں آباد تھے وہ براہ الاسکا ایشیا کے شمال مشرق سے آئے تھے، یہ واقعہ غالباً اب سے پانچ چھ ہزار برس قبل کا ہے لہذا ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے مذہبی عقاید تقریباً وہی ہوں گے جو ایشیا کی مغول اقوام کے تھے۔

قطب شمالی کی قومِ اسکیمو (Eskimo) کا عقیدہ ہے کہ دنیا ارواح رفتگاں سے (جن میں زیادہ تر خبیث روحیں ہیں) معمور ہے۔ اور چونکہ یہ ارواح خبیثہ ہمیشہ انسان کے درپے ایذا رہتی ہیں۔ لہذا ضرور ہے کہ ان سے محفوظ رہنے کے لئے جھاڑنے پھونکنے والوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اور ان کو نذرانے دئے جائیں۔ ان لوگوں میں نہ کوئی دیوتا ہے نہ کوئی معبود۔ اور اسلئے

جنوبی امریکہ کے قدیم قبایل
ان کے یہاں پوجا پاٹ یا عبادت بھی نہیں ہے ۔
میں بھی یہی معتقدات موجود ہیں اگرچہ ان کے خیالات مذہبی کس قدر بلند
ہوگئے ہیں ۔

شمالی امریکہ کے قبایل یقین رکھتے ہیں کہ ارواحِ رفتگاں قایم رہتی ہیں ۔
یعنی جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی روح جانب مغرب زیر زمین کسی مقام
میں چلی جاتی ہے (یہی ہندوؤں کا "پاتال" ہے) مگر اس کے ساتھ ان کا عقیدہ یہ بھی
ہے کہ ہر روح کا ایک "سایہ" ہوتا ہے، جو بعد از مرگ دنیا میں رہ کر لوگوں کو
ستاتا ہے ۔ ان کے یہاں مختلف مظاہر قدرت کے متعلق مختلف دیوتا موجود ہیں ۔
ہر دیوتا کے پجاری علیحدہ ہوتے ہیں ۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دیوتا حسب الطلب
"ان کے سر آتے ہیں" ہندوؤں کی چھوٹی اور جاہل قوموں کا بھی یہی عقیدہ ہے انکے
علاوہ بڑے بڑے دیوتا الگ ہیں ۔ سب سے بڑا دیوتا "زندگی کا دیوتا" یعنے
آفریدگار ہے ۔ جس کی جائے قیام آفتاب ہے یہ وہی دیوتا ہے جو ہندوؤں میں
"سورج نارائن" کہلاتا ہے، ایک دیبی "آسمان کی لافانی بڑھیا" ہے جو چاند
میں رہتی ہے چنانچہ یہاں بھی عوام میں مشہور ہے کہ چاند میں بڑھیا بیٹھی چرخہ
کات رہی ہے، اول الذکر دیوتا کی ایک عجیب کرامت بتائی جاتی ہے، اور
وہ یہ کہ جب یہ دیوتا اپنے سُرین کھجاتا ہے تو زمین پر بارش ہوتی ہے
جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان میں بعض قومیں زیادہ متمدن اور شایستہ
ہوتی گئیں۔ اور اسی نسبت سے ان کے معتقدات مذہبی میں بھی بلندی پیدا ہوئی

ان اقوام متمدن میں ایک قوم مایا (Maya) تھی اس قوم میں قدیم آریوں کی طرح ہوا کا دیوتا (ہندؤں کا ورن، بارش کا دیوتا (آریوں کا اندر) افزائش نسل و فصل کی دیوی (گورا پاربتی ـ پرتھوی) موت کا دیوتا (آریوں کا یم ـ سورج) وغیرہ موجود تھے ان دیوتاؤں کے پجاری نہایت دولت مند اور ان کے مندر نہایت عالیشان تھے۔ مندر کا متولی نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا تھا۔ مایا قوم میں وہ زبردست قومی ہیرو ایسے گزرے تھے جنھیں دیوتا بنا دیا گیا تھا۔ ان میں ایک کا نام "کوکل کان" (Kukalkan) تھا (ممکن ہے "کوکل کان در اصل "گوکل کا نند یا کا تھا" رہا ہو جو سری کرشن جی کی عرفیت ہے) اس قوم میں انسانی قربانی کا رواج تھا، جسے کوکل کان نے منع کر دیا تھا۔ شہر چیچن اتزہ (Chichin) میں ایک مقدس تالاب تھا۔ جس میں قربانی کے انسانوں کا خون ڈالا جاتا تھا۔ قومی ضرورت کے وقت سیکڑوں جوان اور کنواری لڑکیاں دیوتا پر قربان کر دی جاتی تھیں۔

پیرو (Peru) میں بھی یہی تمدن تھا اور وہاں کے ترقی یافتہ لوگ بھی شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے ان چھوٹے دیوتاؤں کے ساتھ بڑے بڑے دیوتا بھی ان کے یہاں موجود تھے۔ ان دیوتاؤں کے بت ٹھوس سونے کے بنائے جاتے تھے۔ جن کو نہایت عالیشان اور خوبصورت مندروں میں رکھا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ وہی پرانے دیوتا۔ بارش، بادل اور بجلی وغیرہ کے بھی پائے جاتے تھے۔ آخری زمانہ میں سورج کا درجہ سب دیوتاؤں پر غالب ہو گیا

تھا۔ جس کی خدمت کے لئے مندر میں حسین وجمیل لڑکیاں رکھی جاتی تھیں۔ (جنوبی ہند کے مندروں میں بھی ایسی دیوداسیاں موجود رہتی تھیں)

امریکہ کی دوسری قدیم قوموں میں ایک قوم ٹولٹیق (Toltecs) تھی جو میکسیکو میں پھیلی ہوئی تھی۔ تمام ملک میں اس قوم کے عالیشان آثار قدیمہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس قوم کا صنم اکبر قوتیز الکوتل (Quetzalcoatl) تھا، جس کے معنی "پردار سانپ" کے ہیں۔ یہ دیوتا اس قوم کا "آفریدگار" تھا لیکن روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دراصل "چندرمان دیوتا" تھا۔ پھر وہ ہوا کا دیوتا بن گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نام کا ایک بادشاہ تھا جس نے انسانی قربانی کی رسم بند کردی تھی۔

ایک روایت میں لکھا ہے کہ اس صنم اکبر کی ایک بیوی بھی تھی جسے وہ لوگ اپنی زبان میں تیز کالتی پوقا (Tezcalti poca) اندھیرے پکش کا چاند کہتے تھے، یہ اخلاقیات کی دیوی تھی اور گنہگاروں کے اعمال کی جانچ اور جزا وسزا کا کام اسی کے سپرد تھا۔

امریکہ کی ایک اور متمدن قوم ازتیق (Aztecs) تھی۔ اس قوم کا صنم اکبر سورج تھا۔ جس پر وہ انسان کی بھینٹ چڑھاتے تھے انسانی قربانی کا اسقدر رواج کسی دوسری قوم میں نہ تھا۔ انکے قدیم دیوتاؤں میں چندرمان دیوتا، ستارۂ صبح کی دیوی[1]

---

[1] جسے یونانیوں میں وینس (Venus)، رومیوں میں جیونو (Juno) آشوریوں میں اشتارتہ (Ishtarte)، عربوں میں زہرہ اور ایرانیوں میں ناہید کہتے ہیں۔

افزایش نسل و فصل کی دیوی[1] اور وتزیلوپوچتلی (Huitzilopochtli) جنگ کا دیوتا تھا۔

الغرض اول اول ان میں سورج، چاند، ہوا، بارش، آگ، رعد وغیرہ سب کے دیوتا موجود تھے۔ اور بعد کو یہ سب دیوتا ملا کر صرف ایک دیوتا بنا لیا گیا اور اسی کو جزا و سزا کے اختیارات دے دئے گئے۔

مذاہب عجم

جس طرح کوئی بڑا دریا اپنے سرچشمہ سے نکل کر وادی کے خشک علاقوں کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں بیسوں ندی نالے آکر مل جاتے ہیں۔ اسی طرح مذہب بھی مختلف زمانوں میں مختلف مدارج ارتقا طے کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں بھی اِدھر اُدھر کے مختلف خیالات و معتقدات داخل ہوتے جاتے ہیں۔ عبرانیوں کا مذہب جسے سب سے پہلا آسمانی یا الہامی دین بتایا جاتا ہے مذاہب بابل مصر و ایران اور یونان کا رہین منت ہے۔ اور انجیل میں تو ایران کے مذہب کا بہت بڑا حصّہ پایا جاتا ہے۔

ایشیائے کوچک کے اس علاقہ سے جہاں قدیم زمانہ میں آریا قوم کی ہندی ایرانی شاخ آباد تھی، اہل ایران نقل و حرکت کر کے ان کوہستانوں میں جا بسے جو شمال میں واقع ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ لوگ

---

[1] مصریوں کے یہاں آثور (Athor) کے نام سے یونانیوں کے یہاں آفرودتیہ (Aphrodite) کے لقب سے اور ہندوؤں کے یہاں پاربتی و پرتھوی کے نام سے موسوم تھی

بحالت گمنامی و خانہ بدوشی پھرتے رہے۔ اس وقت ان کا مذہب وہی تھا جو قدیم ہندوؤں کا تھا۔ رفتہ رفتہ بابل و آشوریہ کے شاندار تمدن وجود میں آئے جنھوں نے وادیٔ فرات و دجلہ کو رشکِ جنت بنا دیا ان کی شان و شوکت اور جلالت و عظمت دیکھ کر دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ جب روز روز کی جنگ و جدال سے دونوں تمدن خاک میں مل گئے اور بابل و نینوا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تو دنیا کی حکومت ایرانیوں کے ہاتھ آئی۔

ان قدیم ایرانیوں کی مقدس کتب ژند و اوستا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی حسب معمول بیشمار روحوں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ہر ملک صوبہ، شہر، گاؤں، دریا اور درخت وغیرہ کا ایک دیوتا تھا اور روحوں کے بقا کے قایل تھے۔ ان کے یہاں سعید اور خبیث دو قسم کی روحیں تھیں۔ ان سب پر ایک آسمانی خدا تھا جس کا نام مترا (Mitra) ہے اور اسی کے ساتھ ہندو مذہب کے دوسرے دیوتا بھی پائے جاتے تھے، مگر بعد میں ایرانی اور ہندو مذہب میں بہت کچھ اختلاف ہوگیا۔ ہندوؤں کا "دیو" ایران میں شیطان بن گیا، اور جو ہستی ہندوؤں میں "آسر" کہلاتی تھی وہی ایران کا "اہور" بن گئی۔ علاوہ ازیں ماحول اور آب و ہوا کے اثر سے دیگر اختلافات بھی پیدا ہوگئے لیکن "اگنی پوجن" (آگ کی پوجا) دونوں میں بدستور قایم رہی۔

چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح میں ایران کے اندر ایک جدید مصلح یا پیغمبر کا ظہور ہوا۔ جس کا نام "زرتشترا" (زرتشت یا زردشت) ہے۔ اس پیغمبر نے

مذہب ایران کی صورت بدل دی اور اس میں زیادہ پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہوگئی۔ زرتشت میں چھوٹے چھوٹے دیوتا سب غائب ہوگئے۔ صرف دو طاقتیں باقی رہ گئیں۔ آہورامزدا (خدائے خیر) اور اہرمن (خدائے شر) یا بالفاظ دیگر یزدان وشیطان۔ اس مذہب میں بھی مصریوں کی طرح یہ عقیدہ موجود تھا کہ انسان کی روح بعد موت باقی رہتی ہے اور اعمال نیک وزشت کی جزا وسزا ملتی ہے لیکن زرتشت نے اس عقیدہ کو اور زیادہ تقویت دی یعنی نیکوکاری اور پاکدامنی پر بہت زیادہ زور دیا۔ اس مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ قوت خیر کے علاوہ ایک زبردست قوت شر بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ بیشمار "اخوان الشیاطین" موجود ہیں۔ آہورامزدا یعنی قوت خیر نے ڈھیل ڈال رکھی ہے۔ لیکن وہ بالآخر ان تمام شیاطین کا استیصال کردے گی اس وقت آسمانی سلطنت کا دور دورہ ہوگا پہلے دنیا آگ سے تباہ کردی جائے گی اور تمام شیاطین ہلاک ہوجائیں گے تو نیکوکاروں کو مسرت ابدی کا انعام ملے گا۔ جن لوگوں کے اعمال زشت ہیں انھیں میعادی سزائیں ملیں گی۔ لیکن جب وہ گناہوں سے پاک ہوجائیں گے تو بہشت میں داخل کردئے جائیں گے اور بالآخر بہشت ہی بہشت رہ جائے گی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس مذہب کے عقاید میں اختلال پیدا ہوا اور بابلی تمدن کا اثر رنگ لایا یعنی پرانا خدا متراد (mitra) جو قدیم زمانہ میں ایک موہوم آسمانی دیوتا تھا۔ اب آہورمزدا کے بجائے تخت جلال پر آبیٹھا اور مستقل طور پر "سورج نارائن" ہوگیا۔

ایران سے یہ مذہب "مترائیت" رومی دنیا میں پہونچا جو ابتداءِ مسیحیت کے وقت تک روم میں موجود تھا۔ چنانچہ ہر سال ۲۵ ر دسمبر کو مترا دیوتا کا جشن میلاد منایا جاتا تھا جس کی ولادت ایک پوشیدہ غار میں ہوتی تھی (یہی زمانہ "سورج نارائن" کی "پیدائش" یعنی آغاز عروج کا ہوتا ہے اور دن بڑا ہونے لگتا ہے) مترا کے بھگتوں کو خون سے بپتسمہ دیا جاتا تھا اور سخت ریاضتیں کیا کرتے تھے۔

فلسطین ارض فلسطین ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا محل وقوع اس طرح واقع ہوا ہے کہ اس کے چاروں طرف بڑی بڑی سلطنتیں واقع تھیں یعنی مشرق میں بابل، جنوب مغرب میں مصر، شمال میں سلطنت حطیوں (Hittites) سواحل پر فنیقیہ (Phoenecia) ان تمام سلطنتوں کی فوجیں اور سوداگروں کے قافلے فلسطین سے گزرتے تھے جن کا سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ آخر میں آکر ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں نے بھی اس ملک کو روند ڈالا۔

یہ باور کرنے کے لئے کافی وجوہ ہیں کہ جس پر اسرار قوم کو قدیم عبرانی فلسطینی (Philistines) کہا کرتے تھے وہ در اصل جزیرۂ کریٹ سے ہجرت کرکے آئی تھی اور اپنے ساتھ سلیمان سے بھی پہلے کا قدیم تمدن لائی تھی۔

مسیح سے تقریباً تیرہ سو برس پہلے جب عبرانی قوم عراق سے ہجرت

کر کے صحرا و بیابان کو عبور کرتی ہوئی حدود شام میں پہونچی تھی، اس وقت وہ بمشکل متمدن و مہذب کہی جا سکتی تھی۔ ان کا قومی معبود جیہوا ( ) تھا۔ یہ آسمانی خدا غالباً اسی قسم کا تھا جس طرح دیگر اقوام و ملل میں آسمان سورج و رعد کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔ اگر عہد نامۂ عتیق کے ابتدائی صحف کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے مضامین معیار اخلاق سے اس قدر گرے ہوئے ہیں کہ اُن کا اور اخلاق مصر، بابل و ایران کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اول اول یہ ایک خانہ بدوش پہاڑی قوم تھی، جس کا مشغلہ صرف مویشی پالنا تھا۔ اس کے بعد جب گرد و نواح کے تمدن کا اثر پڑا تو ان کے خیالات میں وسعت و رافت پیدا ہوگئی اور جب ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں زیادہ روشن خیال انبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوئے تو معیار اخلاق اور بلند ہو گیا جیسے کہ ان کے صحف سے ثابت ہوتا ہے۔ پانچویں صدی میں جب بنی اسرائیل گرفتار ہو کر بابل گئے تو وہاں کی باتیں بھی انھوں نے سیکھیں۔

اس کے بعد مسیح دار تقاء مسیحیت کا زمانہ آیا اور عبرانیوں کا فطری مذہب کسی قدر ترمیم و تہذیب کے بعد دنیا کا اخلاقی مذہب بن گیا۔

یوروپ باشندگانِ ہنگری اور ترک کے علاوہ جتنی ایشیائی قومیں ہیں اقوام فن (فنلینڈ کے باشندے) مجار (Magyar) وہ اور یوروپ کی تمام اقوام و ملل قوم آریا کی نسل ہیں۔ جو ایرانیوں اور

ہندؤں کی مورث اعلیٰ تھی۔ ایک شاخ اس قوم کی جانب مغرب پہونچی اور سواحل بحیرۂ بالٹک پر مسلط ہوگئی۔ یہ تیوتانی (Teutonic) کہلائی دوسری شاخ جانب جنوب گئی اور یونان و اطالیہ پر قبضہ جمالیا۔ تیسری شاخ وسطی ممالک میں رہی اور وہ اب سلافی (Slavo) کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے یورپ کی تمام قدیم اقوام کا مذہب تقریباً ایک ہی تھا۔ یونانیوں کا سب سے بڑا آسمانی دیوتا ذیوس (Zeus) تھا جو روم میں جیوپتر (Jupiter) کہلایا اور ہندؤں میں اسی کو دیوپتر کہنے لگے۔ دراصل ان تمام ناموں کا مادہ لفظ دیو (Deva) ہے۔ یونانیوں اور رومیوں کی "دھرتی ماتا" اس آسمانی باپ کی بیوی تھی۔ دونوں قوموں میں جنگ کا دیوتا موجود ہے جو یونان میں "ایریس" اور رومیوں میں (Mars) کہلایا آگ کا دیوتا یونانیوں میں ہفاستوس (Hephaestus) تھا اور رومیوں میں ولکن (Vulcan) اور یہی قدیم ہندیوں کا اگنی تھا۔ پانی کے دیوتا کا نام یونانی زبان میں پوسی آئڈن (Poseidon) اور رومی زبان میں نپچون (Neptune) ہے ______ یونانیوں میں عشق و محبت کی دیوی آفرودیتہ (Aphrodite) ہے اور رومیوں میں وینس (Venus) کہلاتی ہے، یہی بابلیوں کی اشتار، عربوں کی زہرہ اور ایرانیوں کی ناہید ہے۔

ناروے۔ سویڈن۔ جرمنی اور انگلستان کے قدیم باشندے بھی یہی

مذہب رکھتے تھے۔ ہفتہ کے دنوں کے ناموں پر غور فرمائیے۔ خود بخود معلوم جائے گا مثلاً سنڈے (Sunday) آفتاب کا دن۔ ہندی آدیتوار یا اتوار۔ منڈے (Monday) چاند کا دن۔ ٹیوزڈے (Tuesday۔) وڈنسڈے (Wednesday) (Mercury's day) ووڈن اور مارس دونوں جنگ کے دیوتا ہیں اسی طرح (Mars day) جیوپٹر کو تھورس (Thorum) کہا جاتا تھا جس سے تھرسڈے (Thursday) بنا۔ وینس کو فریجا کہتے تھے۔ اس سے فریجا سڈے یا (Friday) بنا اسی طرح سٹرڈے دراصل سیٹرن (Saturn) زحل سے بنا۔

ان ناموں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قدیم اقوام یوروپ کا مذہب دراصل مظاہر فطرت کا مذہب (nature religion) تھا اور اس کے علاوہ درختوں، دریاؤں، جنگلوں، کنوؤں وغیرہ کے بھی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ (ہندوؤں میں اسی قسم کے سیکڑوں دیبی اور دیوتا موجود ہیں) الغرض عہد تاریخ میں قدم رکھنے سے پہلے تمام یوروپ کا وہی قدرتی مذہب تھا جو دیگر اقوام عالم کا تھا اور دیوتاؤں اور دیویوں میں بعض بزرگان قوم بھی شامل کر دئے جاتے تھے (جیسے ہندوؤں میں رام اور کرشن موجود ہیں) یونانیوں کے آسمانی دیوتا کوہ اولمپس (Olympus) پر رہتے تھے اور وہیں ان کی بہشت تھی۔ اسی طرح ایرانیوں کی بہشت بھی کرہ البرز پر تھی۔ اور

ہندوؤں کے دیوتا کیلاش اور میرو پربت پر رہتے تھے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ یونانیوں کے خیالات میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ حکماء کے ذہن سے تمام مختلف دیوتا محو ہو گئے اور وہ آخر میں توحید پرست ہو گئے۔ چنانچہ سقراط، فلاطون اور ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ لیکن حکیم زینو(Zeno) اور ابیقورس (Epicurus) ملحد تھے وہ کسی خدا یا دیوتا کو نہیں مانتے تھے۔

مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل یونانیوں نے یورپ کے قدیم قبائل کا دیوتا "دیونی سوس" (Dionysos) بھی اپنے دیوتاؤں میں شامل کر لیا۔ یہ دراصل شراب اور فسق و فجور کا دیوتا تھا۔ یہ ہر سال مرتا اور دوبارہ زندہ ہوتا تھا۔ ان کے تہوار خاص اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ سوانگ اور تماشے ہوتے تھے۔ جلوس نکالے جاتے تھے۔ لیکن دراصل ان تہواروں سے مقصد اس حقیقت کو یاد دلانا تھی کہ سال میں ایک بار زمین کی قوت نمو مر جاتی ہے جسے خزاں سمجھنا چاہیئے۔ اور پھر پیدا ہو جاتی ہے، جو موسم بہار ہے۔ مصر، شام اور بابل میں بھی اسی قسم کے تہوار منائے جاتے تھے۔ جن میں دیوتا مر کر زندہ ہوتا تھا۔

الغرض جملہ مذاہب قدیمہ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ (۱) عہد وحشت میں انسان کا اعتقاد یہ تھا کہ اس کا ایک سایہ ہمزاد ضرور ہے اور مرنے کے بعد روح اسی دنیا میں رہتی ہے (۲) روحیں سعید و خبیث

دو قسم کی مانی جاتی ہیں جو انسان کو فایدہ یا نقصان پہونچا سکتی ہیں۔ (۳) قدرت کی ہر چیز میں روحوں یا دیوتاؤں کا خیال پیدا ہوا اور سیکڑوں دیوتا بن گئے (۴) متعدد دیوتاؤں میں سے چند کو بلند مرتبہ دیکر مذہب میں روحانیت پیدا کی گئی (۵) متعدد دیوتاؤں کو باہم ملاکر ایک بڑا دیوتا بنایا گیا اور اس طرح توحید کی طرف میلان ہوا (۶) توحید پرستی کے اندر ہی غور و خوض کرتے ہوئے روحانیات و الٰہیات سے لاادریت پیدا ہوئی۔ اور احکام مذہب احکام اخلاق وحسن معاشرت بن گئے (۷) روحانیت غائب ہونے کے بعد ذات واجب الوجود کا اعتقاد متزلزل ہوا اور الحاد کی بنیاد پڑی جیساکہ فرانس اور امریکہ میں آج کل نظر آرہا ہے۔

مسیحیت قدیم موسوی یا یہودی مذہب میں چند ترمیمیں کرنے کے بعد عیسائی مذہب بنایا گیا۔ اس کی تعلیم اخلاقی ہے۔ ہر بات میں تزکیۂ نفس بلکہ نفس کشی کی ہدایت پائی جاتی ہے۔ اس مذہب کے بانی مسیح خیال کئے جاتے ہیں اناجیل اربع جن میں مسیح کی سوانح عمری اور ان کی تعلیم ہے، وفات مسیح کے بہت دنوں کے بعد ان کے حواریئن نے لکھی تھیں۔ مسیح کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ (۱) وہ اپنی والدہ مریم کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور مریم کنواری تھیں۔ اس لئے مسیح ابن اللہ ہیں۔ (۲) یسوع نے حسب اقتضاء وقت شریعت موسوی میں ترمیم و تنسیخ کی اور ایک جدید اصلاح شدہ مذہب اخلاق جاری کیا؛ (۳) علماء یہود نے یسوع پر

بغاوت کا الزام لگایا اور رومی حاکم کے فرمان سے وہ مصلوب کرکے دفن کردئے گئے (۴) تین دن بعد وہ اپنی قبر سے زندہ ہوکر باہر نکلے اور اپنے شاگردوں سے مل کر انھیں آخری ہدایات کیں، اور پھر آسمان پر اپنے باپ خدا کے پاس چلے گئے۔ (۵) آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کرکے تمام بنی نوع انسان کو گنہگار بنایا۔ مسیح نے مصلوب ہوکر انسان کے گناہوں کا کفارہ کردیا۔ (۶) قیامت کے قریب مسیح دوبارہ دنیا میں آئیں گے (۷) مسیح مامور من اللہ تھے اور ان کا مذہب الہامی ہے۔

جب مسیحیت کو دیگر قدیم مذاہب کے ساتھ رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو انسان حیران رہ جاتا ہے کہ جس مسیحیت کو الہامی مذہب بنایا جاتا ہے وہ صرف قدیم مذاہب کی مختلف روایات وعقاید کا مجموعہ ہے جسے مختلف رنگوں میں پیش کیا گیا ہے مثلاً جب کوئی جویائے حق جو مسیحیت سے بھی واقف ہے قدیم مصری مذہب و رسوم کے حالات پڑھتا ہے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اعمال کے جانچ کی تعلیم جو مسیحیت پیش کرتی ہے وہ مسیح سے کم از کم پانچ ہزار سال پیشتر مصر میں موجود تھی وہ دیکھتا ہے کہ زبور کی بہترین دعائیں وہی ہیں جو دیگر مذاہب کی دعاؤں سے لی گئیں وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اکثر قدیم مذاہب میں ایک آسمانی دیوتا کسی کنواری عورت پر اپنا پرتو ڈال کر حاملہ کردیتا ہے اور پھر ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے جو الوہیت سے متصف ہوتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اسکندریہ میں جہاں مسیحیت نے زیادہ تر نشوونما پائی۔ قدیم مصریوں کے اندر حد درجہ کی

رہبانیت تھی - پاکدامنی کو انھوں نے ایک دیوی بنا رکھا تھا اور اس دیوی کے مندر میں صدہا کنواریاں رہا کرتی تھیں -

جب وہ بابلی مذہب کی سیر کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے مقتدایانِ دین بھی - تکوینِ عالم - تخلیق آدم - ہبوط آدم - جنات عدن - اور طوفان کی وہی روایتیں سناتے ہیں جو یہود و نصاریٰ کے یہاں پائی جاتی ہیں - قدیم بابلیوں میں بھی ایک دن یوم سبت ہوتا تھا - وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جس طرح عیسائی لوگ مریم کو ایک دیوی اور پاکدامنی کا نمونہ سمجھتے ہیں - اسی طرح اہل بابل اشتار دیوی کو نکوکاری اور پارسائی کی دیوی مانتے تھے - آخر میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ بابلیوں کا مذہب ترقی کرتے کرتے توحید پرستی ہو گیا تھا حالانکہ مسیحیت کو آج تک یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی وہ یہ بھی دیکھے گا کہ بابلیوں کا ایک ہر دلعزیز خدا ہر سال مر کر زندہ ہوتا تھا، اور اس کا دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا - بابلیوں نے اپنے مذہب میں مسیح کی طرح ایک نجات دہندہ خدا بھی مان رکھا تھا -

جب وہ ایران قدیم کے مذہب کی سیر کرتا ہے - تو دیکھتا ہے کہ مسیح سے صدیوں پیشتر وہاں ایک مصلح یا پیغمبر پیدا ہوا جس نے لوگوں کو اعتدال پسندی، نکوکاری اور پارسائی کی تلقین دے کر ایک خالص روحانی مذہب سکھایا، وہ دیکھے گا کہ ایرانیوں میں صدیوں پیشتر یہ عقیدہ موجود تھا کہ خدائے بزرگ و برتر ایک روز تمام کائنات کو بذریعۂ آتش نابود کر دیگا

بعد ازاں "آسمانی بادشاہت" کا دور دورہ ہوگا۔ لوگوں کے اعمال نامے جانچے جائیں گے نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دی جائے گی۔
ایران کے مذہب مترائیت میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اُن کا ایک دیوتا ہر سال ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوتا ہے جس کا جشن مولود ہر سال نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ یہ دیوتا بنی نوع انسان کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے لیتا ہے۔ روم میں اس دیوتا کی پیدائش کے دن یعنی ۲۵ دسمبر کو ہر سال سرکاری طور پر تعطیل ہوتی تھی (یہی عیسائیوں کا بڑا دن ہے) الغرض وہ یہ دیکھتا ہے کہ عیسائیت میں کوئی بات ایسی نہیں جو دیگر مذاہب قدیمہ سے نہ لی گئی ہو۔

دوسرا باب

مذہب سے انحراف

چونکہ مذاہب کا وجود علی الخصوص اُن مذاہب کا جو اپنے آپ کو اخلاق و معاشرت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، قدرتاً متاثر ہوا کرتا ہے وقت و ماحول سے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انسانی تمدن تو قوانین ارتقاء کے ماتحت ترقی کرے اور مذہب اپنے حال پر قایم رہے۔ کیونکہ یہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان مذہب کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ مذہب انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے مذہب خود کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک کیفیت و عرض ہے جو انسان پر اس کی دماغی تربیت، تمدنی ماحول اور نظام اجتماعی کے تحت لاحق و طاری ہوتی ہے اس لئے اگر کوئی مذہب یہ دعوے کرے کہ اس کی اولین شریعت ہمیشہ یکساں طور پر ہر زمانہ و ملک کی موافقت کر سکتی ہے تو اس سے زیادہ جھوٹ دنیا میں صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک ثقیل چیز کو بلندی کی طرف پھینکیں اور کہیں کہ زمین اس کو اپنی طرف نہ کھینچے گی خود انسان کی تاریخ پر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے

اُس پر لاکھوں برس کا وہ لامعلوم زمانہ گزرا جب اس میں اور ایک جانور میں قطعی کوئی فرق نہ تھا، اس کے بعد پانچ چھ لاکھ سال کا وہ زمانہ آیا جب اس نے پتھر کے بھدّے آلات بنانا سیکھے۔ پھر حجری عہد عتیق آیا۔ جو تین چار ہزار سال تک قایم رہا۔ پھر مسیح سے ۲۰ ہزار سال قبل عہد حجری جدید شروع ہوا جو ۳ ½ ہزار سال قبل مسیح تک جاری رہا۔ اس کے بعد عہد تاریخی شروع ہوا جس کی ارتقائی صورت موجودہ عہد تہذیب و تمدن ہے۔

انسان کے ان مختلف منازل ارتقاء میں مذہب کے اندر جس طرح تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کرچکے ہیں کہ اول اول مذہب کا خیال کس طرح صرف وہم و گمان پر قایم ہوا۔ اس کے بعد کیونکر مظاہر قدرت اور آثار فطرت کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اخلاق پر بنیاد رکھکر کس طرح ان مذاہب کو پیدا کیا گیا جنھیں الہامی کہا جاتا ہے اس طرح ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ مختلف ممالک کے مذہبی معتقدات میں بہ ادنےٰ اختلاف کس قدر مشارکت پائی جاتی ہے اور عقاید کی اشاعت کن اُصول کے تحت کی گئی۔ جب تک انسان کا مذہب کسی مرتّب و مدوّن صورت میں نہیں آیا وہ بالکل ذاتی و بیضرر چیز تھا لیکن اس کے بعد جب ایک مخصوص جماعت علم مذہب یا علم رسم و رواج جاننے والی پیدا ہوگئی تو اُس نے اپنا اقتدار قایم کرنے کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنایا اور اول وقت سے لیکر تا ایندم، کوئی زمانہ، کوئی مذہب ایسا نہیں ہوا جسے اس نوع کے جھوٹے مدعیان مذہب نے مجروح نہ کیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اس جماعت کا یہ اقتدار عرصہ تک قایم رہا لیکن جب علوم وفنون کی ترقی ہوئی، عقول انسانی میں سمجھنے اور غور کرنے کی اہلیت پیدا ہوئی، تو رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی ظاہر ہونے لگی، جس نے احکام مذاہب اور معتقدات پر غور کرنا شروع کیا، اور آہستہ آہستہ فقہ کے ساتھ علم کلام کی بھی بنیاد پڑی جو اپنی وسعت کے لحاظ سے کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا اور جب تک ایک متنفس بھی مذہب کا ماننے والا موجود ہے اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی کیونکہ علم کلام کی انتہا اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ مذہب سے انکار کر دیا جائے اور ان کی پابندیوں کو بالکل توڑ کر رکھدیا جائے ۔ وہم وخیال کی آپ کتنی ہی تاویل کرتے جایئے ۔ وہم وخیال ہی رہیگا اس لئے اس کا اختتام اسی طرح ممکن ہے کہ آپ وہم وخیال ہی سے گزر جائیں ۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہد قدیم کی قوموں میں اول اول بُت پرستی کس طرح شروع ہوئی اور متعدد بتوں کا وجود مٹ کر کیوں کر صرف ایک بڑے بُت کی ہستی قایم ہوئی ۔ یہ گویا سب سے پہلا خیال تھا جسے ہم ایک لحاظ سے توحید کہہ سکتے ہیں لیکن چونکہ اس میں بھی بہت کچھ مادیت پائی جاتی تھی اس لئے فطرت انسانی مطمئن نہ تھی اور کبھی کبھی اس میں بغاوت کے آثار پائے جانے لگتے تھے، چنانچہ زردشت، کنفوشس اور بودھ انھیں لوگوں میں تھے جو مادیت سے علحدہ ہو کر اپنے مذہب کی بنیاد قایم کرنا چاہتے تھے اور

اس میں کلام نہیں کہ اس وقت زمانہ کے لحاظ سے جو کچھ انھوں نے کیا وہ بالکل وہی تھا جیسے آج کوئی معقول پسندی کی بنار پر تمام مذاہب کی ضرورت سے انکار کردے۔

عہد آخر کے مذاہب میں سب سے اخیری مذہب جس کے بعد اسلام کا ظہور ہوا اور جس نے غیر معمولی وسعت اختیار کی، عیسوی مذہب تھا۔ لیکن اس کی جو حالت ہوئی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم غور سے اس کا مطالعہ کریں تو ہمارے لئے بہت کچھ سامانِ عبرت وبصیرت اس میں موجود ہے۔

میں نے اس وقت تک اسلام سے کوئی بحث نہیں کی اس پر سب سے اخیر میں بطور نتیجہ بحث کرکے بتاؤں گا کہ اس تمام تلاطم خیال میں سکون پیدا کرنے والا صرف اسلام ہی ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ اسلام نہیں جو آج کل پایا جاتا ہے اور نہ وہ اسلامی تعلیمات جو مولویوں، فقیہوں اور محدثوں نے ہمیں بتائیں بلکہ وہ تعلیم وتلقین جو فطرت نے بتائی، جو قرآن میں موجود ہے اور جو ایسی حقیقت وصداقت ہے کہ اگر اس کو سمجھ لیا جائے تو تمام انسانی تفرقے خواہ وہ تمدن ومذہب سے متعلق ہوں، یا سیاسیات واقتصاد سے فوراً مٹ سکتے ہیں۔ اور ساری دنیا ایک ہی مقصود کو سامنے رکھ کر ایک ہی شاہراہ پر ہم خیال ہوکر گامزن ہوسکتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کو عیسوی مذہب کے ارتقاء وزوال

کے مناظر دکھاؤں جو آج دُنیا کی تمدن ترین اقوام کا معمول بتایا جاتا ہے، کیونکہ اس مذہب کی تاریخ کا بہت بڑا اثر اسلام پر پڑا اور جو جو صورتیں کلیسہ و اصحابِ کلیسہ کے انہدام کی وہاں پیدا ہوئی تھیں وہی اب اسلام کے لئے پیدا ہو رہی ہیں جس طرح تمام مذاہب کی ابتدائی حالت میں معلمین مذہب کا اقتدار رہا ہے۔ اسی طرح مسیحیت میں بھی پادریوں کا اثر بہت قایم تھا، لیکن جب انھوں نے دینِ عیسوی کی رسم و رواج کی پابندیوں کا ایک طلسم بنا دیا جیسا کہ موجودہ اسلام میں پایا جاتا ہے۔ تو لوگ رفتہ رفتہ اس سے گھبرانے لگے اور سب سے پہلے لیوتھر اور کالوین نے ایک جدید اصلاح یافتہ مذہب "پروتستانیت" (Protestantism) کے نام سے قایم کیا، لیکن چونکہ یہ اصلاح بھی پوری طرح دل کو نہ لگتی تھی اس لئے جب یورپ میں دورِ نہضت (Renaissance) شروع ہوا تو تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں میں مذہبی عقاید و مسایل کی چھان بین بھی ہونے لگی اور انھیں معلوم ہوا کہ دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نہ انجیل سے تعلق رکھتی ہیں نہ کلیسہ سے یہ وہ زمانہ تھا جب روم میں عہدِ شہنشاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اطالیہ سے یہ ذوق منتقل ہو کر رفتہ رفتہ فرانس اور انگلستان پہونچا اور وہاں بھی اسی قسم کے مباحث ہونے لگے۔ انگلستان میں شیکسپیر سے پہلے وہاں کے سب سے بڑے ڈراما نویس مارلو (Marlowe) سر والٹر ریلے (Walter Raleigh) اور بہت سے دیگر روشن خیال لوگوں نے متشککین کا ایک کلب قایم کر رکھا تھا اور مذہبی اُمور پر بحث کیا کرتے تھے۔ جس وقت

اطالیہ کی طرف سے ان خیالات کی تائید ہوئی تو تحقیق و تدقیق کا بازار زیادہ گرم ہوگیا اور جو باتیں بائبل میں درج تھیں ان کا از روئے درایت مضحکہ اُڑایا جانے لگا اس وقت سیاح لوگ مختلف ممالک کا اکتشاف عمل میں لا رہے تھے پردۂ اخفا سے ایسی ایسی نئی زمینیں برآمد ہو رہی تھیں جو مصنفین بائبل کے خواب میں بھی نہ آئی تھیں، دوسری طرف نگاہیں دوربینوں کے ذریعہ سے فلک الافلاک تک پہونچ رہی تھیں اور آسمان کے متعلق تمام بائبلی معلومات لغو و مہمل ثابت ہو رہی تھیں۔

الغرض جدید معلومات کے سامنے مذہب کی قدیم معلومات پادر ہوا نظر آرہی تھیں اور پُرانے اعتقادات کا شیرازہ درہم برہم ہوا جاتا تھا۔ لوگ سمجھنے لگتے تھے کہ جس چیز کو "الہامی" اور "بانی" مذہب بتایا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت معمولی بلکہ ادنیٰ دماغوں کے منتشر خیالات ہیں اور رفتہ رفتہ مذہب کی وقعت ان کے دلوں سے اس قدر محو ہوگئی کہ قومی اور ملی اغراض کے مقابلہ میں بھی اس کو نظر انداز کیا جانے لگا۔

چند دلوں میں مشککین، لاادریین، اور معقولیین (Rationalists) کا ایک گروہ ہر ملک میں قایم ہوگیا، جنھوں نے آزادی کے ساتھ مذہب کے متعلق لکھنا شروع کردیا۔ سترھویں صدی کے وسط سے لیکر اٹھارھویں صدی کے وسط تک انگلستان میں بڑے بڑے زبردست لاادریہ مصنفین گزرے جن میں بہت زیادہ مشہور ہربرٹ (Herbert)، بلاونٹ (Blount)

ٹنڈل (Tindel) لارڈ شیفٹسٹری (Shaftesbury) لارڈ بولنگ بروک (Bolingbroke) کولنس (Collins) وغیرہ تھے اب خشک میسحیوں (Puritans) کا زمانہ گزر چکا تھا، ملک میں ہر جگہ آزادی ضمیر کا دور دورہ تھا اور پادریوں کے اخلاق اس قدر گر گئے تھے کہ کلیسہ کے اسقف حرامکاری کو عیب نہ سمجھتے تھے اور امراء کی ناجائز اولادیں آسانی سے اسقف کا مرتبہ حاصل کر سکتی تھیں۔ اس زمانہ کی ملکۂ انگلستان کیرولائن (Caro-line - ۱۶۸۳ء - ۱۷۳۷ء) بھی اس قدر متشکک واقع ہوئی تھی کہ مرتے وقت اس نے کلیسہ کا توشہ لینے سے انکار کردیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسنے دین عیسوی ترک کر دیا تھا۔ الغرض اس زمانہ کے بڑے بڑے مدبرین اور صاحبان علم وفضل معقولیت پسند تھے۔ یہ لوگ بجز خدا کے معجزہ ووحی وغیرہ کو نہیں مانتے تھے اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے دین عیسوی ترک کر دیا تھا قدیم کلیسہ کے معتقدین نے ان کا نام "کافر وملحد" رکھ دیا تھا الغرض گزشتہ دو سو برس سے مخالفین مسیحیت کی ایک زبردست جماعت انگلستان میں چلی آرہی ہے اور جس قدر تعلیم بڑھتی جاتی ہے۔ اُسی قدر اس جماعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پریس کی ایجاد اور ارزاں کتب کی اشاعت نے ہر جگہ مذہب کے خلاف ہیجان پیدا کر دیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جب اٹھارھویں صدی میں صنعت وحرفت وتجارت کا بازار گرم ہوا اور ہر طرف امن وسکون قایم ہوا تو اشاعت علوم وفنون

کے ساتھ "عقلیت" (Rationalism) کو بھی ترقی ہوئی۔ گیٹے (Goete) شلّیر (Shiller) اور کانٹ (Kant) وغیرہ سیکڑوں شعرا اور فلسفی پیدا ہو گئے۔ جن کی دلنشین شاعری اور شیوا بیانیوں نے عوام کے دل میں جگہ کی اور مذہبی روایات کی عمارت متزلزل ہو کر زمین پر آ رہی۔

اسی زمانہ میں انگلستان کی طرح فرانس میں بھی آزادی کا دور شروع ہوا۔ پروٹسٹنٹ جماعت کے قتل عام کے بعد فرقۂ یسوعی (Jesuits) ملک سے نکال دیا گیا تھا، لوگ مذہبی فرقوں کے جھگڑوں سے تنگ آ گئے تھے اور ان کا دل مذہب کی طرف سے بیزار تھا۔ فلسفیوں نے جدید معلومات کی بنا پر بائبل اور مسیحیت پر حملے کرنا شروع کر دئے۔ اور اصحاب کلیسہ اس قدر برہم ہوئے کہ جب والٹیر (Voltaire) نے اپنے فلسفیانہ خطوط (Philosophical letters) شایع کئے تو اسکی جلدوں کو فراہم کر کے جلایا گیا۔ اور غریب والٹیر کو جان بچانے کے لئے ایک نواب کے قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقۂ علمار کی رہی سہی وقعت بھی لوگوں کے دلوں سے اُٹھ گئی۔

والٹیر کا ہمعصر روشو (Rousseau) بھی موحد تھا اسنے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے مسیح کا حُلّہ تقدس چاک کر کے پھینکدیا اور لوگوں پر ثابت کیا کہ جس یسوع ناصری کو مسیحی دنیا خدا مان رہی ہے،

اس میں ذرہ بھر بھی الوہیت نہیں تھی اور وہ خدا کا ایک سیدھا سادھا پرہیزگار بندہ تھا۔ الغرض یہ عقیدہ تمام فرانس میں پھیل گیا۔ اور وہاں سے ہسپانیہ و جرمنی وغیرہ پہونچا اور اس طرح اکثر بلاد یوروپ کا مذہب "والٹریت" ہوگیا، ہر جگہ درباروں اور بازاروں میں والٹیر کی تصانیف کا چرچا تھا اور سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اس کی کتابیں نہ پڑھی جاتی ہوں۔

مسیحی مقتدایانِ دین نے والٹیر کو دجال (Anti-christ) کہا اور جس قدر ہو سکا گالیاں دیں۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ ہوا۔ دنیا اسی دجال کی پیرو ہوتی گئی۔ اسی زمانہ میں یوروپ کا اہم ترین واقعہ انقلاب فرانس کا تھا۔ جس نے اگرچہ قدیم نظام حکومت کو تہ و بالا کردیا۔ لیکن سیاسی اور مذہبی آزادی کو اور تقویت پہونچائی۔ یہی وہ زمانہ ہے۔ جس نے تین نہایت زبردست اور سحر بیان اہل قلم طامس پین (Thomas Paine) روسو (Rousseau) اور والٹیر (Voltaire) پیدا کئے یہ تینوں خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ لیکن وحی کے قایل نہ تھے۔

اس کے بعد یوروپ میں "مشککین" (Sceptics) کی ایک جدید جماعت پیدا ہوئی۔ جنھوں نے ایمان باللہ کو بھی بالائے طاق رکھدیا۔ یہ لوگ ملحد (Atheist) یا مادیئن (materialist) کہلائے اس جماعت میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ مثلاً ویدرو (Diderot) ہولباش (Holbach) قندورسے (Condorcet) اور

ہلوی ٹیس (Helvetius) یہ جو فیلسوفوں کے نام سے مشہور ہوئے اور ان کی قیادت میں مذہب کے خلاف بغاوت برابر بڑھتی رہی۔

یہ ریب و شک کوئی "ہوا کا رُخ" نہ تھا کہ مٹ جاتا۔ بلکہ توسیع علوم و فنون کے ساتھ اس میں زیادہ شدت و عمومیت پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ فرانس کے "حکماء" کے تشکک پر گہرا علمی رنگ چڑھ گیا۔ اور فرانس کے مشہور فلسفی ڈیکارٹ (Descartes) نے تو یہاں تک کہدیا کہ جانوروں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے روح (Soul) کہا جاسکے اسکے نزدیک ایک بندر یا عقاب کا جسم مشین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

علاوہ ازیں ڈیکارٹ نے دنیا کے سامنے ایک نظریۂ ارتقاء یہ بھی پیش کیا کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت و سیارگان سدیم یا ذرات نور (Nebula or Cosmic dust) سے پیدا ہوئے اور اس طرح گویا ذات واجب الوجود کی ہستی کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا۔ اٹھارویں صدی کے اخیر تک اس تحریک میں علمی رنگ زیادہ غالب آگیا اور بائبل کی نکتہ چینی ایک علمی مشغلہ ہوگیا۔ یعنی لوگ اصل عبرانی بائبل کا بہت زیادہ غور و فکر سے مطالعہ کرنے لگے اور اس تجزیہ و تحلیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبرانی عہد نامۂ عتیق کا راز فاش ہوگیا اور یہ بات ظاہر ہوگئی کہ قدیم صحف انبیاء بنی اسرائیل مختلف زمانوں کی تصانیف ہیں جن کو بہت کچھ تحریف و ترمیم کے بعد ایک جگہ مدوّن کردیا گیا ہے۔ اور یہ کام مقتدایان دین یہود نے عیسیٰ سے چند صدی پیشتر کیا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جسے بائبل کا انتقاد عالیہ کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہم مختلف زمانوں کی اردو یا

فارسی زبانوں میں تفریق وتمیز کر سکتے ہیں۔ اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ زبان ولی دکھنی کی ہے۔ یا میر کی۔ انشاء کی ہے یا داغ وغالب کی۔ اسی طرح جدید فن نقد کے ذریعہ سے قدیم صحف بنی اسرائیل یا تالمود کے زمانۂ تصنیف کا تعین ہو جاتا ہے جدید علوم خصوصاً نظریۂ ارتقاء نے توریت کے باب پیدائش کی بُری طرح دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اور اب چونکہ آثار قدیمہ کے اکتشاف سے صحیح تاریخی معلومات حاصل ہو چکی ہے۔ اس لئے بائبل کی تاریخی نوعیت بھی خاک میں مل گئی ہو

اسی زمانہ میں فن تاریخ نے بھی علمی صورت اختیار کر لی ہیوم (Hume) اور گبن (Gibbon) نے قدیم تاریخی روایات وحکایات کو معیار درایت پر کس کر ایسی تاریخیں لکھیں کہ ان کے مقابلہ میں تمام قدیم تاریخی داستانیں کالعدم ہو گئیں۔ خصوصاً گبن کی تاریخ کے ایک باب نے جو "عروج مسیحیت" پر ہے دُنیا کی آنکھیں کھول دیں اور اس تحریک کو اور زیادہ تقویت پہونچائی، گبن ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عالم بشری کی تاریخ اساطیر الاولین سے خالی الذہن ہو کر لکھی۔ اور جس طرح مشہور فرانسیسی ماہر فلکیات لاپلے (Laplace) اور جرمن فلسفی وہیئت داں کانٹ (Kant) یہ نظریہ قایم کر کے کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت وسیارگاں "سدیم" یا "لطخات صحابیہ" یا "ذرات نور" (Nebulae) کے ذریعہ سے پیدا ہوئے ہیں کسی خالق السماء کی ضرورت باقی نہیں رکھی۔ اسی طرح گبن نے بھی ثابت کر دیا کہ تاریخ انسانی میں بھی کسی خالق الارض کا ہاتھ نہیں ہے۔ الغرض جدید علم تاریخ نے تمام

خرافی قصے صفحات تاریخ سے نکال کر پھینک دئے اور ثابت کر دیا کہ تاریخ عالم کا نشو و نما اُصول ارتقاء کے تحت ہوا ہے۔

جدید علم تاریخ کا ایک اثر دنیا پر اور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ دنیا قدیم یونانی و رومی تمدن و شائستگی کی مداح ہوگئی۔ اور ان کے قدیم علوم و فنون از سر نو زندہ ہوگئے۔ اب تک مسیحی دنیا قدیم یونانیوں اور رومیوں کو مشرک و بُت پرست سمجھ کر سزاوار جہنم سمجھتی تھی۔ لیکن جدید علم تاریخ نے ثابت کر دیا کہ عہد نامۂ جدید یعنی مجموعۂ اناجیل میں ایک بھی پاکیزہ خیال یا تعلیم ایسی نہیں ہے جو اقوال افلاطون (Plato) یا حکماء "رواقیین" (Epicurians) کی تعلیمات میں موجود نہ ہوں اس انکشافات نے ارباب تشکیک کے ہاتھوں میں جدید حربہ دے دیا اور وہ اور بھی زیادہ قوی ہوگئے۔ اس کے بعد حفریات اثری (Archeological Excavations) کا دور شروع ہوا۔ جب نپولین اعظم نے مصر فتح کر لیا تو یوروپ کے صدہا علماء مصر پہونچ گئے۔ اور انھوں نے آثار برآمد کر کے بائبل کی تاریخ اور روایات کو اور بھی زیادہ مشکوک کر دیا۔ اس کے بعد جب حفریات بابل و نینوا سے دنیا کی آنکھیں کھل گئیں اور یہاں کے آثار برآمد ہوئے تو مٹی کی تختیوں اور منقوشات اشوریہ (Cuniform) وغیرہ سے عجیب و غریب تاریخی حالات معلوم ہوئے اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء بنی اسرائیل نے جو روایات و حکایات دُنیا کے سامنے الہامی کہہ کر پیش کی تھیں وہ درحقیقت روایات بابل و نینوا کا مجموعہ

ہیں جن کو مناسب ترمیم و تنسیخ کے بعد پیش کر دیا گیا۔ بائبل و نینوا میں جو روایات پانچ چھ ہزار پیشتر رائج تھیں وہی درحقیقت "اسرائیلیات" بن گئیں۔ تخلیق عالم، پیدائش آدم و حوا، جنت عدن۔ ہبوط آدم۔ طوفانِ نوح وغیرہ کی تمام اسرائیلی روایات لفظ بہ لفظ بابلی روایات ہیں۔ ان انکشافات کے باعث قصص بائبل سے لوگوں کا ایمان اُٹھ گیا اور وہ وحی و الہام کے بھی منکر ہو گئے اور جب انھوں نے توریت کی کتاب پیدائش کے حالات کو علم طبقات الارض کی روشنی میں دیکھا تو وہ بائبل سے اور زیادہ بدگمان ہو گئے کیونکہ یہ روایات قدیم بابل و نینوا میں اس وقت رائج تھیں۔ جب عبرانیوں کو لکھنا پڑھنا تک نہ آتا تھا۔

آثارِ قدیمہ کے ساتھ ہی ساتھ فلسفہ نے بھی لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ کیونکہ جب عقیدہ "الہیت" ([illegible]) نے وحی و الہام کے عقیدہ کی بیخ و بنیاد کو متزلزل کر لیا۔ تو لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ ہستی، روح اور وجود باری تعالیٰ کو منطقی دلایل کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے کیونکہ جب تک ان دونوں کا وجود ثابت نہ ہو جائے وحی و الہام لاشئے محض ٹھہرتے ہیں۔ یعنی وحی سے پہلے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی وحی بھیجنے والا موجود بھی ہے۔ الغرض فلسفیوں نے جملہ اسباب و علل کو سامنے رکھ کر بحث کی۔ بہت سے دلایل غیر اطمینان بخش ثابت ہوئے اور اس طرح عقاید مذہبی کو اور زیادہ صدمہ پہونچا۔

وہ آخری چیز جس نے عقائد مذہبی پر ضرب کاری لگائی سائنس — ہے۔ مختلف علوم متداولہ نے ستاروں، پھولوں، پتھروں، جانوروں، اعضاء جسمانی، جوہر مادی وغیرہ کی نسبت وہ راز ہائے سربستہ منکشف کئے کہ دُنیا محو حیرت ہوگئی۔ ہر شخص سائنس کی تعریف میں رطب اللسان ہوگیا۔ علاوہ ازیں سائنس نے وہ ہندسی وکیمیاوی ثبوت پیش کئے کہ ان پر کسی شخص کو شک وشبہ کی گنجایش باقی نہ رہی۔ اس لئے جب سائنس میدان میں آیا تو لوگ اس کی طرف اس قدر زیادہ مایل ہوئے کہ تاریخ یا فلسفہ کے بھی اتنے گرویدہ نہ ہوئے تھے۔ مذہب وسائنس کی آویزش اس وقت سے شروع ہوئی جب ڈارون (Darwin) کی کتاب "مصدر انوع" (Origin of species) شایع ہوئی۔ ڈارون کا کمال یہ ہے کہ اس نے قانون ارتقاء کو اس خوش اسلوبی اور واقعاتی بنیاد پر پیش کیا کہ ہر شخص کی توجہ اس طرف مایل ہوگئی۔ پادریوں کو نظریۂ ارتقا سے اس لئے سخت مخالفت پیدا ہوئی کہ ازروئے بائبل آدم کی پیدائیش کو صرف چھ ہزار سال گزرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دُنیا کے سامنے انسان کے بنائے ہوئے وہ آلات حجری پیش کردئے جو پندرہ بیس ہزار سال پیشتر کے بنے ہوئے ہیں علاوہ ازیں بائبل کی طرف سے مینار بابل اور اختلاف السنہ کی روایت پیش کی جاتی ہے۔ لیکن سائنس نے انیسویں صدی میں ایک جدید علم کی بنیاد ڈالی جسے عرف عام میں علم الالسنہ (Philology)

کہتے ہیں۔ اس علم نے تحقیق و تدقیق کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ سنسکرت، فارسی اور اکثر یورپین زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق رکھتی ہیں، گویا وہ سب ایک ہی قدیم زبان کی شاخیں ہیں۔ اور اسی طرح بائبل کی روایت دربارۂ اختلاف السنہ غلط قرار پاتی ہے۔

بائبل کا بیان ہے کہ خدا نے نوحؑ کے زمانہ میں تمام دنیا کو تباہ کر دیا تھا۔ اور دنیا کی آبادی کو صرف چھ ہزار سال گزرے ہیں۔ لیکن سائنس نے دُنیا کے سامنے طبقات الارض کی مدد سے ثابت کر دیا کہ کرۂ زمین کی خشک سطح رفتہ رفتہ کروڑوں برس کے بعد بنی ہے اور زمین کی ساخت بھی قانون ارتقاء کے ماتحت ہوئی۔

بائبل کی پہلی آیت یہ ہے کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا لیکن فلکیات نے یہ ثابت کر دیا کہ اجرام سماوی دفعتاً نہیں بنے۔ بلکہ قانون ارتقاءٗ کے تحت رفتہ رفتہ سدیم یا ذرات نور سے بنے ہیں۔

الغرض موجودہ زمانہ میں انسان کے قلب و دماغ دونوں مذہب سے باغی ہو گئے ہیں۔ اور اب ہم ایسی دُنیا میں رہتے ہیں۔ جس کے زمین و آسمان بالکل نئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا۔ کہ اب نسل انسانی ہی دوسری ہوگئی ہے اور اس کی زندگی و معاشرت ملل سابقہ کی زندگی سے قطعی جداگانہ ہے اس کے آئین و قوانین کی توضیع و تسوید عرش بریں پر نہیں ہوتی اس کا دستورالعمل لوح محفوظ سے نقل ہو کر نہیں آتا بلکہ انھیں کے دماغ ان کو سوچتے اور انھیں کے فاؤنٹن پن

انھیں ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔

انسانی خیالات و معتقدات کی کایا پلٹ سب سے زیادہ ان انکشافات نے کی ہے جو فلکیات سے متعلق ہیں۔ اب یہ امر بھی متحقق ہو گیا ہے کہ کس ستارہ کی عمر کتنی ہے۔ اگر "کن فیکون" کے ساتھ ہی تمام اجرام سماوی معرض ظہور میں آئے ہوتے تو خواہ وہ "سبع شداد" ہوتے یا نجوم لاتعد و لاتحصٰی ان سب کی عمریں برابر ہوتیں۔ لیکن سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مختلف ستاروں کی عمروں میں اربوں سال کا تفاوت ہے۔ اور بہت سے اجرام سماوی ایسے ہیں جو ہنوز سحابی یا سدیمی حالت میں ہیں گویا ہماری کائنات ہی نئی ہے۔ جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا اور ہماری دنیاوی زندگی ابدی سلسلۂ حیات کی ایسی حقیر کڑی ہے۔ جس کے لئے سوال و جواب، میزان و صراط اور بہشت و دوزخ کا طول امل کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس سے قبل کا زمانہ وہ تھا جب لکھنا پڑھنا صرف مقتدایان دین تک محدود تھا۔ مسلمانان ہند چھوٹی قوموں کو سوا پارہ سے زیادہ قرآن اور "راہِ نجات" یا "صبح کا ستارہ" سے زیادہ کچھ نہیں پڑھنے دیتے تھے اور ہندوؤں کے نزدیک تو کسی شودر کے کانوں تک وید منتر کا پہونچنا ہی گناہ عظیم تھا۔ لیکن اب دُنیا بدل گئی ہے۔ زمانہ اور ہے۔ اب کوئی گاؤں اور قصبہ اسکولوں سے خالی نہیں ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں درجنوں ہائی اسکول اور متعدد کالج نظر آتے ہیں۔ قدم قدم پر یونیورسٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی قوم ایسی باقی نہیں

جس نے اپنا جداگانہ ادارہ قایم نہ کرلیا ہو جگہ جگہ بڑے بڑے کتب خانے اور دارالمطالعہ قایم ہیں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگئی ہے اور چند سال بعد دُنیا میں کوئی شخص ناخواندہ نہ رہے گا۔ لاسلکی و ریڈیو نے زمین کی طنابیں کھینچ کر فاصلۂ زمان و مکان کو محو کردیا ہے اور ایک شخص دہلی یا لکھنؤ کے کسی مکان میں بیٹھ کر، لندن، امریکہ و جاپان کی باتیں اس طرح سُن سکتا ہے گویا اس کے سامنے کوئی شخص جلسہ میں تقریر کر رہا ہے۔ الغرض اب دنیا بہ لحاظ علم و فضل بہت دور پہونچ گئی ہے اور ناممکن ہے کہ قدامت پرست مقتدایان کی حکومت عرصہ تک قایم رہے۔

پہلے برسوں میں ایک کتاب کی نقل ہوتی تھی۔ لیکن اب ایک دن میں لاکھوں نسخے تیار ہوسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں سلسلۂ نقل و حمل اس قدر ترقی کرگیا ہے کہ لندن کی چھپی ہوئی ایک کتاب دو ہفتہ کے اندر دُنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ جاتی ہے۔

الغرض اب نئی دُنیا ہے اور نیا آسمان۔ ترکوں نے ادارۂ خلافت کو ٹھکرا دیا ہے۔ حالانکہ وہ پانسو برس سے اس پر اپنی جانیں قربان کرتے چلے آتے تھے۔ ہندوستان میں جدید روح کے زیر اثر خود ہندوؤں نے بُت شکنی شروع کردی ہے اور پہلے جو پنڈت اور اونچی ذات کے ہندو شودر کے سایہ کو بھی ناپاک سمجھتے تھے اب وہ انھیں سے بغلگیر نظر آتے ہیں، چینیوں نے اپنی لمبی لمبی چوٹیاں کاٹ کر پھینکدی ہیں، اہل مصر اپنی معاشرتی مذہبی اور

سیاسی آزادی کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ افریقہ کے حبشی بھی اب اس قدر روشن خیال ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی ملی حکومت کو علٰحدہ قایم کرنے کی فکر میں ہیں ایران و افغانستان جو اب تک مجتہدین اور ملاؤں کے جال میں پھنسے ہوئے تباہ ہو رہے تھے اب رفتہ رفتہ آزاد ہو رہے ہیں۔ ریاست میکسیکو کے لوگ مذہب سے اس قدر بیزار ہو گئے ہیں کہ وہ پادریوں کو نشانۂ بندوق بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ہزاروں گرجا غیر آباد ہو کر مسمار ہوتے جا رہے ہیں۔

یقیناً یہ دُنیا کا بالکل نیا دور ہے اور آج تک ایسا ذہنی انقلاب کرۂ ارض پر کبھی رونما نہ ہوا تھا۔ اور نہ اصلاح معاشرت کا اس قدر زبردست جہاد اس سے قبل کبھی کیا گیا۔ اب مذہب کی جگہ "خدمت العباد" لیتی جاتی ہے۔ اور ہزاروں قسم کے ادارے خدمت بنی نوع انسان کے لئے کھلتے جاتے ہیں اب دُنیا "دوزخ و جنت" کی حقیقت کو سمجھ گئی ہے۔ اب وہ "نفس مطمئنہ" کو اپنی جنت اور "ضمیر کی لعنت و ملامت" کو اپنا جہنم جانتی ہے اب دُنیا عبادت سے متنفر ہوتی جاتی ہے۔ وہ عبادت کو ایسا ہی سمجھتی ہے جیسے سلاطین و امراء کی خوشامد۔ الغرض یہ دنیا ایک نئی دُنیا ہے۔ ایک انقلابی دُنیا ہے اور اس کے در و دیوار نعرہائے "انقلاب" سے گونج رہے ہیں۔

تیسرا باب

مذہب کا مستقبل

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مذہب کی ابتدا دُنیا میں کیونکر ہوئی اور عہدِ حاضر میں اس کے ضعف و اضمحلال کے کیا اسباب ہیں۔ اس پر قیاس کر کے مستقبل کے لئے بہ آسانی یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب جو عملی طور پر اب بھی تقریباً فنا ہو چکا ہے، اقتصادی و ذہنی اعتبار سے بالکل محو ہو جائے گا اور ایک زمانہ آنے والا ہے جب مذہب کی تعلیمات و اعتقادات کو اس نگاہ سے دیکھا جائے گا جس طرح آج "سکونِ زمین و حرکتِ افلاک" کے نظریۂ قدیم کو دیکھا جاتا ہے یا جس طرح ایک ماہر آثارِ قدیمہ پُرانے کھنڈروں کو کھود کر بہت سے محو شدہ واقعات کو سامنے لاتا ہے۔

مذہب کو سب سے زیادہ صدمہ پہونچانے والے اسباب کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر اس سے قبل آچکا ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا کا ہر وہ قدم جو علم و حکمت کی طرف بڑھتا ہے، مذہب کو سو قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے اور بدقسمتی سے مذہب کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو ان کا

مقابلہ کر کے اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔

علوم وفنون کے سلسلہ میں سب سے بڑا صدمہ مذہب کو جس چیز سے پہونچا وہ قانون ارتقاء کی تحقیق تھی، اس نے نہ صرف مذہب کے بہت سے مسلمات تاریخی کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ بلکہ خود مذہب کے اندر اسی اُصول ارتقاء کے تحت تغیر وتبدل کا ہونا فطری اقتضاء قرار پایا۔ جو لوگ قدامت پرستی کو اصل مذہب سمجھتے تھے، خود ان کے ایمان متزلزل ہو گئے اور انھوں نے بھی اس اُصول کی صداقت مان کر مذہبی معتقدات میں تغیر وتبدل کو گوارا کیا۔

چونکہ مذہب کی بناء صرف یقین پر ہے اور فطرت انسانی صرف ان باتوں کا یقین کرنا چاہتی ہے جو خود اس کے مشاہدہ وتجربہ میں آئیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ علمی مشاہدات وتجربات کے مقابلہ میں مذہبی بیانات کو ترجیح دیجاتی اور انسانی ضمیر ان پر مطمئن ہو جاتا۔

اول اول جب مذہب وحکومت میں زیادہ فرق نہ تھا اور حکومت کے مفہوم سے اس کی مذہبیت کو جدا نہیں کر سکتے تھے، تو بر بناء اس استبداد کے جو شخص حکومتوں میں ہمیشہ پایا جاتا ہے، جبراً بزور شمشیر مذہب کا تلخ گھونٹ ہر شخص کو گوارا کرنا پڑتا تھا اور قوت وعسکریت سے علم وحکمت کی تبلیغ اور آزادی فکر وضمیر کو محو کیا جاتا تھا، چنانچہ تمام مذاہب کی تاریخ میں اس نوع کے سیکڑوں واقعات نظر آتے ہیں کہ مرجوعات مذہب کے خلاف جب کسی نے نکتہ چینی کی تو اس کی قید وبند میں ڈالا گیا، دار پر کھینچا گیا۔ جلایا، اور جس طرح ممکن ہوا حریت د

فکر و رائے کی اشاعت کو روکا گیا۔

جب یونان قدیم کے باشندوں نے ایران، کریٹ اور مصر والوں سے علوم وفنون کے حصول کا ذوق حاصل کیا، اور انھوں نے محسوس کیا کہ روایات مذہبی بالکل لغو چیز ہیں اور انسان کو خود اپنے عقل و حواس سے کام لے کر کسی نتیجہ پر پہونچنا چاہئے تو وہ جہاں بھی گئے اسی خیال کو ساتھ لے گئے اور چونکہ یہ تاریخی صداقت ہے کہ جب کسی قوم میں آزادی اور تحقیق کی جستجو بڑھتی ہے تو مذہب کا انحطاط ہونے لگتا ہے، اس لئے اہل مذاہب نے ان کو ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دیا جب وہ ایتھنہ (Athens) پہونچے جو اس زمانہ کا بڑا عظیم الشان شہر تھا تو وہاں علم و حکمت کے ساتھ لوگوں کی دشمنی کو اور زیادہ شدید پایا۔ یہاں تک کہ انکساغورس نے جب وہاں ایک علمی درسگاہ قائم کرنا چاہی تو اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی اور آخر کار اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ایتھنہ کے فلاسفہ کا دعوے تھا کہ وہ صرف روحانی حقیقتوں کی طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ غریب سقراط باوجود تبلیغ روحانیت اپنی جان سلامت نہ لے جا سکا۔

اس کے کئی صدی بعد اسکندریہ میں جسے یونانی مصری شہر کہنا چاہئے زیادہ موافق حالات کے تحت علم و عقل کی کارگاہ قایم ہوئی ہر چند یہاں اتنے مذاہب پائے جاتے تھے کہ خداؤں کی تعداد کے لحاظ سے پجاری بھی کافی نہیں تھے۔ لیکن شاید یہ مذہبی گمراہی کے ردعمل کا وقت تھا کہ اس کے بعد ہی لوگ چونکے اور علم و حکمت کی ترقی ہونے لگی، مگر بدقسمتی سے اسی وقت ایک اور نئے مذہب مسیحیت نے

سیاسی اقتدار حاصل کر لیا اور اس نے یونانی عقل و حکمت کے آخری چراغ (Haypatia)[1] کو گل کر کے رکھدیا پہلا ایکہزار سال کا زمانہ جو (Thales)[2] سے شروع ہو کر (ہپاٹینز) پر ختم ہوتا ہے، علم و مذہب کی جنگ کا نہایت اہم زمانہ ہوا ہے اور سب سے زیادہ جس مذہب نے عقل کی مخالفت کی وہ عیسوی مذہب تھا۔

ظہور اسلام

اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اور علم کی روشنی مذاہب کے ظلمت کدوں میں نہ پھیل سکی۔ ہرچند علم و فراست کے تمام خزانے یونانی کتابوں میں محفوظ تھے۔ لیکن یونان کی عیسائی حکومت کے زمانہ

---

[1] یہ اسکندریہ کے ایک ماہر ریاضیات و فلکیات کی بیٹی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی کے اخیر میں پیدا ہوئی۔ اس کی فراست و دانائی کے سبب سے اسکندریہ میں اس کا خاص اثر تھا اور مشرق کے تمام حصوں سے طلبہ آکر اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس نے فلسفۂ اشراقیین اور فلسفۂ ارسطو کو ملا کر ایک جدید فلسفۂ انتخابیت (Electicism) پیدا کیا تھا یہ فلکیات اور علوم میکانکی کی بڑی ماہر تھی۔ آخرکار وہاں کے اسقف اعظم نے بعض وحشی راہبوں کو متعین کیا جو اسے گاڑی سے کھینچ کر کلیسہ میں لے گئے اور وہاں عریاں کر کے اس کے کوڑے مارے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا دیا۔

[2] یونان کا نہایت قدیم فلاسفر تھا جو مسیح سے تقریباً سات سو سال قبل پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا یونانی تھا جس نے تخلیق کائنات پر بحث کی اور بتایا کہ ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے۔

میں کس کو ان کے تلاش کی جراءت ہو سکتی تھی۔

آخر کار اسلام کا ظہور ہوا اور اسنے عرب کے وحشیوں میں وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس نے بعد کو دمشق و بغداد میں گہوارۂ علم و حکمت کی صورت اختیار کی اور چاروں طرف سے عقل کی روشنی سمٹ کر وہاں آنے لگی، یونانی، ایرانی، اور شامی علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے اور مذہب اسلام نے ان کی اشاعت کو گوارا کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن خلفاء، امراء و سلاطین اسلام نے پوری ہمدردی و اعانت سے کام لیا۔ دمشق و بغداد سے منتقل ہو کر یہ تہذیب شمالی افریقہ ہوتی ہوئی اسپین پہونچی اور وہاں علوم و فنون کی ترقی نے وہی رنگ اختیار کیا جو یونان قدیم میں کسی وقت پایا جاتا تھا اس کے بعد چند یہودی و مسیحی سیاح یہاں آئے اور عربوں کے تراجم و تصانیف کو اٹلی، فرانس اور انگلستان لے گئے، پھر چونکہ مسلمان صقلیہ اور اطالیہ کے جنوب میں بھی آباد تھے۔ اس لئے یہاں سے بھی چشمۂ علم یوروپ کی طرف بہا اور عقلیت کی ترقی ہونے لگی۔ لیکن کلیسہ نے جس قدر اس کی مخالفت کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ بیکن کو اپنی آدھی زندگی زندان کلیسہ میں بسر کرنا پڑی۔ البریٹ گریٹ کو کلیسہ کے اسقف اعظم کی خدمت دے کر خاموش کیا گیا۔ پرنیکس نے فیثا غورس کے اصول کی تصدیق کا اس وقت تک اعلان نہیں کیا جب تک وہ عذاب استنطاق (Inquisition) کی دسترس سے باہر نہیں ہو گیا۔ آرنلڈ کا ایک مجرم کی طرح جا بجا تعاقب کیا گیا، جین ڈی روکیوٹالڈ نے زنداں میں جان دی — سکواسکولی اور برونے جلائے گئے۔ گلیلو سخت عذاب میں مبتلا کیا گیا اور ساکیس

مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ لیکن چونکہ دُنیا میں عقل وحکمت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس کا نشہ ایسا نہیں جو آسانی سے اُتر جائے۔ اس لئے باوصف کلیسہ کی شدید ترین مخالفت کے اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب رفتہ رفتہ مذہب میں ضعف ہوا تو اتنی رعایت اہل علم کے ساتھ روا رکھی جانے لگی کہ کیمیا، طبیعیات وفلکیات کی تعلیم پر ان کا آگ میں جلایا جانا بند ہو گیا۔

جب اُنیسویں صدی شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ علم وحکمت کے انشعابات نے ساری دنیا پر اثر ڈالنا شروع کیا، تو مذہب کے سخت گیر دیوتا کا بُت ٹوٹا۔ اور عقیدت نے توریت وانجیل میں تاریخی، آثاری، علمی، اخلاقی ہزاروں قسم کے نقایص نکال کر مسیحیت کا جنازہ نکال دیا۔ اور اب پہلی دفعہ ارباب علم وفن نے اطمینان سے بیٹھ کر سمجھا کہ دنیا کیوں کر پیدا ہوئی! اس کی تاریخ کیا ہے؟ مذہب کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی الہامی حیثیت کس مصلحت کا نام ہے اور یہ آزادیٔ خیال رفتہ رفتہ اس قدر بڑھی کہ اب گفتگو بائبل کے الہامی وغیر الہامی ہونے میں نہیں ہوتی بلکہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بائبل ایسی لغو ومہمل کتاب کو کیوں مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے اور یہ کہ آیا مسیح کا حقیقتاً کوئی وجود بھی تھا یا نہیں۔

جو لوگ بائبل کو مدارس سے خارج کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے حسب ذیل دلایل پیش کئے ہیں:۔

(۱) اگر بائبل الہامی ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہوا لیکن اب کسی

ملک کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ لہذا کوئی ضرورت نہیں کہ بچوں کے معصوم دلوں میں تعصبات مذہبی پیدا کیے جائیں۔ اگر بائبل الہامی نہیں بلکہ انسان کی تصنیف ہے تو اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں ہے اور اس کو پڑھانا بچوں کا وقت ضایع کرنا ہے۔

(۲) بائبل دو ہزار برس قبل کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور وہ زمانہ انسان کے عالم طفولیت کا تھا۔ اب انسان جوان ہے۔ لہذا کوئی ضرورت نہیں کہ بچوں کی سی باتیں جوانوں کو پڑھائی جائیں۔

(۳) بائبل خود کوئی کتاب نہیں بلکہ مجموعۂ صحایف ہے جو مختلف زمانوں میں تصنیف ہوئے۔ علاوہ ازیں بائبلوں میں بھی فرق ہے یعنی عبرانی بائبل ۳۹ صحایف پر مشتمل ہے۔ انگریزی پروٹسٹنٹ بائبل میں صرف ۳۶ صحایف ہیں۔ رومن کیتھولک بائبل میں ان سب کے علاوہ ایک صحیفہ موسوم بہ "ابوقریفہ" (Apocrypha) اور بھی ہے اس طرح سب ملاکر ۷۲ صحایف ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کون سا مجموعہ صحیح ہے۔ لہذا ایسی مشتبہ کتاب کا پڑھانا مضرت رساں ہے۔

(۴) اصلی بائبل عبرانی زبان میں تھی۔ رائج الوقت بائبلیں اس کا ترجمہ ہیں ترجمہ میں معانی اکثر بدل جاتے ہیں۔ لہذا اگر بائبل پڑھی جائے تو اصل پڑھی جائے ترجمہ کا پڑھانا فضول ہے اور چونکہ اسکول کا ہر بچہ عبرانی نہیں پڑھ سکتا اور نہ ایک مردہ زبان کے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ لہذا بائبل کے ترجمہ کا درس

موقوف کیا جائے۔

(۵) بائبل میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو علوم و انکشافات جدیدہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ لہٰذا غلط کتاب کا بچوں کو پڑھانا ان کے ذہنی رجحانات کو تباہ کرنا ہے۔

(۶) بائبل کے مختلف صحیفے مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غزلیں بھی ہیں۔ قصے کہانیاں بھی ہیں، ڈرامے بھی ہیں روایات بھی ہیں، خرافات بھی ہیں، اور تھوڑی سی تاریخ بھی ہے۔ اور یہ سب مختلف زمانوں کی تصانیف ہیں، لیکن پڑھاتے وقت بچوں کو ان کی نسبت کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ اس لئے ایسی مجہول کتاب کی تعلیم میں وقت کا ضایع کرنا ہے۔

(۷) بائبل میں بہت سے معجزات درج ہیں۔ جو از روئے سائنس خلاف فطرت ہیں۔ ان کے پڑھنے سے بچوں میں توہم پرستی پیدا ہوتی ہے جو عقل و دماغ کے لئے مضر ہے۔

(۸) سائنس نام ہے عقل منظم اور دانش مرتب کا لیکن بائبل نام ہے خلاف عقل باتوں کے مجموعہ کا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ عقلی پر بے عقل کو کیونکر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

(۹) بائبل مجموعۂ اضداد ہے اور اس لئے وہ کوئی اخلاقی تعلیم بھی صحیح معنے میں نہیں دے سکتی۔

(۱۰) بائبل، ملوکیت اور مشرقی ظلم و استبداد سکھاتی ہے۔ مثلاً "خدا نے

ڈرو بادشاہ کی عزت کرو" اور دُنیا اب ملوکیت و استبداد کے اُصول کو قایم نہیں رکھ سکتی۔

(۱۱) بائبل عورت کو ذلیل بتاتی ہے۔ حالانکہ از روئے انصاف مرد عورت دونوں کا درجہ مساوی ہونا لازم ہے۔

(۱۲) بائبل جنگ کی تعلیم دیتی ہے۔ حالانکہ دنیا کو امن و صلح کی ضرورت ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی مذہب کے فنا ہونے کے چند در چند اسباب تھے۔ ایک یہ کہ اس کی تعلیمات ترقی و علوم و فنون کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں، دوسرے یہ کہ دُنیا سے ملوکیت و استبداد کی رسم اُٹھی اور اُصول حکمرانی میں مذہب سے کوئی تعلق نہ رکھا گیا۔ تیسرے یہ کہ لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ بائبل سے ان کی زندگی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ حیات انسانی کی جستجو کا شافی جواب دے سکتی ہے، اس کا تاریخی پہلو بالکل لغو، علمی پہلو بالکل مہمل ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیم یکسر ناقابل عمل ہے۔ وہی یوروپ جس نے مسیح اور تعلیم مسیح کی حمایت میں شدید ترین ظلم کرنے سے بھی باک نہ کیا تھا۔ آج اس کا یہ عالم ہے کہ وہ مسیح کو جاہل محض اور بائبل کو مجموعۂ مزخرفات بتاتا ہے۔ وہ انجیل کی اس روایت کو دیکھتے ہیں جس میں یونس کا تین دن تین رات تک مچھلی کے پیٹ میں رہنا بیان کیا جاتا ہے، اور ہنستے ہیں، وہ علانیہ کہتے ہیں کہ مسیح کو دُنیا اور قدرت کا اتنا علم بھی حاصل نہ تھا جتنا آج ایک اسکول کے لڑکے کو حاصل ہے۔ نہ وہ تاریخ سے آگاہ تھے نہ جغرافیہ سے۔ نہ علم الحیات

سے ان کو آگاہی تھی۔ نہ طبعیات سے، نہ فلکیات کا علم انھیں حاصل تھا، نہ سیاسیات کا۔ رہ گئی تعلیم اخلاق سو اس کا یہ حال ہے کہ نہ پہلے کبھی اس پر کوئی انسان عمل کرسکتا تھا نہ آج اس کا امکان ہے۔

فرض کیجئے گزشتہ جنگ کے موقع پر مسیح اتحادیین کی جنگی کونسل کے موقعہ پر موجود ہیں، اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دشمن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں "اپنے دشمن سے محبت کرو" دریافت کیا جاتا ہے "کیا ایسے دشمن سے محبت کی جاسکتی ہے جو سر سے پاؤں تک مسلح ہوکر گھر تباہ کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہے" وہ فرماتے ہیں "اگر کوئی تمھارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کردو" پھر پوچھا جاتا ہے کہ "دشمن کے تمام مظالم کا کیا علاج ہے" مسیح جواب دیتے ہیں "جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان کے ساتھ بھلائی کرو، ان کے لئے دعائے خیر مانگو جو تم سے برا سلوک کرتے ہیں" کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عقل کی باتیں ہیں اور اگر مسیح واقعی جنگ کونسل میں شریک ہوکر یہی تلقین کرتے تو ان کے ساتھ وہی سلوک نہ ہوتا جو کسی وقت یہودیوں اور اہل رومہ نے کیا تھا۔

——— کیونکہ مسیح کی یہ تلقین اخلاق آج بہ لحاظ سیاست و تجارت تمدن و معاشرت، ایسی لغو و ناقابل عمل تعلیم ہے کہ اس سے زیادہ ناقص ذہن انسانی میں کوئی اور بات آہی نہیں سکتی۔

مسیح کہتے ہیں کہ "اگر کبھی ایک حقیر سی چڑیا بھی مرکر زمین پر گرتی ہے تو آسمانی باپ کا دل دکھ جاتا ہے" لیکن اگر واقعی کوئی آسمانی باپ ہے تو

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کیوں نہیں وہ ان تمام مظالم کو روکتا جو حقیر جرثومے یعنی بڑی بڑی انسانی ہستیوں کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

مسیح کا ارشاد ہے کہ "آسمانی باپ سر کے تمام بالوں کا شمار رکھتا ہے" لیکن ایک سائنس داں دریافت کرسکتا ہے کہ کیا وہ آسمانی باپ اُن خوردبینی خلایا کا بھی شمار رکھتا ہے، جو رحم کے اندر خدا معلوم کسی مقدس راہب کی تعمیر میں مصروف ہیں یا کسی قزاق و رہزن کی آفرینش میں۔

مسیح فرماتے ہیں:۔ "ایک باپ اپنے بیٹے کو روٹی دینے پر قادر نہیں ہے یہ آسمانی باپ ہی کا کام ہے جو مانگنے والوں کو دیتا ہے اور ان کی دُعائیں قبول کرتا ہے" لیکن آج تک نہیں دیکھا گیا کہ کسی مرنے والے کی ماں یا بیوی کی دُعا جان بچانے میں مقبول ہوئی ہو یا کوئی بڑے سے بڑا راہب، مولوی یا ولی اس کا دعوٰی کرسکے کہ وہ اپنی دُعا سے رائفل کی گولی کو راستہ میں روک لے گا۔ اب وہ زمانہ ہے جب دنیا اس حقیقت کو جان گئی ہے کہ اگر ہمارا رومال کثیف ہے تو اسے ایک پیسہ کا صابن ہی صاف کرسکتا ہے اور اگر سارے زمانہ کے اولیاء کرام اپنی تمام عمر محض دُعا کی مدد سے اس کو صاف اور اُجلا کرنے کی کوشش میں صرف کردیں تو کامیاب نہ ہوں گے۔

مسیح کہتے ہیں:۔ "آسمانی باپ کتنا مہربان ہے جو اچھے بُرے دونوں پر پانی برساتا ہے" حالانکہ علمی نقطۂ نظر سے یہ امر کس قدر مضحکہ خیز ہے اگر واقعی پانی کا برسانا آسمانی باپ کے ہاتھ میں ہے تو وہ اپنے اس

اختیار کو کس قدر بے اُصولی سے استعمال کرتا ہے کہ جہاں ضرورت نہیں، وہاں سیلاب کے سیلاب برپا کر دیتا ہے اور جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں گرتا اور ہزاروں لاکھوں انسان قحط سے مرجاتے ہیں۔

مسیح کا نظریۂ عفو و درگزر کے باب میں "سات ستر" بار کا ذکر ہے یعنی ۴۹۰ مرتبہ انگلستان کا وزیر حربیہ مسیح سے پوچھتا ہے کہ "ہم ایک جرمن آبدوز کشتی کے کپتان کو جس نے ایک اسپتالی جہاز ڈبو دیا ہے کتنی مرتبہ معاف کریں" جواب ملتا ہے کہ "جب تک وہ ۴۹۰ اسپتالی جہاز ڈبوتا رہے" ایک حاکم عدالت دریافت کرتا ہے کہ "ایک شخص کو جو اپنی بیوی کو بے قصور چھوڑ رہا ہے اور اس کے معاش کا کفیل نہیں ہوتا کتنی مرتبہ معاف کرکے رہا کریں کیا وہی ۴۹۰ بار؟" مسیح کہتے ہیں "ہاں"

وزیر حربیہ اور مجسٹریٹ دونوں یہ جواب سُن کر اپنے ماتحتوں سے کہتے ہیں کہ "مسیح تو یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ تم تو اس جرمن آبدوز کے کپتان کو فوراً گولی سے ماردو اور اس شخص کو جیل میں بند کردو۔ جب تک ۳۰ پونڈ ماہوار بطور معاش اپنی بیوی کو دیتے رہنے کی ضمانت نہ داخل کرے"۔

الغرض جس حد تک مذہبی معتقدات کا تعلق ہے۔ مسیحیت کا وجود دُنیا میں باقی نہیں رہا، اور نہ موجودہ علمی و تمدنی ترقیوں کے زمانہ میں اس کے باقی رہنے کی کوئی صورت تھی۔ اس وقت یورپ و امریکہ کا اپنے آپ کو مسیحی یا عیسائی کہنا حقیقتاً ایک قومی یا نسلی تعیّن سے زیادہ کوئی مفہوم نہیں

رکھتا اور نہ دُنیا میں کوئی مذہب باقی رہ سکتا ہے اگر وہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہیں، اگر اس کی تعلیمات اس قدر وسیع جامع اور حاوی ہیں کہ ترقی ذہن وخیال کی رفتار کا ساتھ دے سکیں تو بے شک اس کا وجود باقی رہ سکتا ہے، ورنہ اس کے قایم رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اب ان تمام تمہیدی بیانات کے بعد آئیے مذہب اسلام پر غور کریں کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ مذہبی دُنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے کس حد تک صحیح ہے۔

مذہب اسلام کی تعلیمی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور اسکے بعد محمدؐ کی سیرت کہ ان دونوں میں اصولاً کوئی فرق نہ ہونا چاہئے۔ ان دو ذریعوں کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی احادیث کا مجموعہ اور مذہب اسلام کی تاریخ ان کو کوئی حقیقی یا معیاری ذریعہ تحقیق کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انسے اگر کوئی کام لیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اسلام نے خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی کس قدر موافقت کی۔ لوگوں نے اسلام کے مفہوم میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور یہ کہ اس میں حشو وزواید کا اضافہ کب اور کن اسباب کے تحت ہوتا رہا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اسلام کی تعلیمات سے بحث کریں، مذہب کے مفہوم کو متعین کر لینا ضروری ہے۔

مذہب اگر انسان کے لئے کوئی ضروری چیز ہے تو دیکھنا چاہئے کہ یہ

ضرورت محض فطرت کے اقتضاء سے پیدا ہوتی ہے یا صرف ماحول کے اثر سے۔

اس کا جواب دینے کے لئے زیادہ غور و تامل کی حاجت نہیں ابتداءً آفرینش سے لیکر اس وقت تک انسان کی تاریخ اس نتیجہ پر پہونچنے میں مدد کرتی ہے کہ مذہب کا خیال بڑی حد تک فطری اقتضاء ہے اور وہ محض اس لئے کہ انسان بالطبع تمدن پسند ہے اور تمدن کا نظام بہت کچھ منحصر ہے۔ کسی اعتقادی قانون پر یہ ضرور ہے کہ ماحول کے اثر سے مذہبی خیالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، لیکن مذہب کا خلاق ماحول نہیں ہے بلکہ فطری اقتضاء ہے۔

اس لئے ایک مذہب کے بہترین مذہب ہونے کی علامت اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اصول فطرت کے مطابق ہو یعنی فطرت انسانی اپنے اکتسابات کے لحاظ سے جس قدر ترقی کرتی جائے، مذہب نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ دے بلکہ ہمیشہ ترقی کا ایک بلند نصب العین سامنے رکھے یہ ایک ایسا اصول کسی مذہب پر نقد کرنے کا ہے کہ اس کی صحت سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اچھا تو آیئے سب سے پہلے اسی کو سامنے رکھکر اسلام کی جانچ کریں کہ وہ کس حد تک اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

قرآن میں مذہب اسلام کی حقیقت جن الفاظ میں بیان کیگئی ہے یہ ہیں:

"فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا و لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم"

یعنی اسلام نام ہے صرف اس فطرت الہٰی کا جس پر انسان پیدا ہوا ہے، اور فطرت الہٰی یہ ہے کہ جو قانون نظام عالم کا اس نے بنایا ہے اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہی مسلک و مذہب ایسا ہے جو ہمیشہ قایم رہنے والا ہے۔ ان چند الفاظ میں جو فلسفہ مذہب کا بیان کیا گیا ہے وہ اس قدر حاوی اور ایسا مکمل ہے کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے اس کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ :۔

مذہبِ اسلام فطرت انسانی کا ساتھ دینے والا ہے اور اس بام ترقی تک پہونچانے والا ہے جو انسان کے تمام قوار کامنہ کو بروئے کار لانے کے بعد بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ترقی کے اُصول کیا ہیں؟ یعنی اس کلیہ کو ہمیشہ سامنے رکھنا کہ جو اُصول نظام عالم اور ارتقار کا قدرت نے مقرر کر دیا ہے اس میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی اور ایک انسان کا فرض ہے کہ ہمیشہ سعی و کوشش سے کام لیکر ترقی کی راہیں پیدا کرے۔ اسی اُصول کو خدا نے کہیں آیات محکمات کہا ہے کسی جگہ "لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" سے تعبیر کیا ہے، کبھی "بصائر للناس" بتایا ہے اور کبھی حبل اللہ سے اس کی صراحت کی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اگر انسان اس حقیقت کو سمجھ کر کار بند ہوا اور اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لے کہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" (ایک شخص کو اتنا ہی ملیگا یقینی وہ کوشش کرے گا) تو پھر اس کا

نتیجہ کیا ہوگا، ترقی کی صورت کیا ہوگی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔ "وعداللہ الذین آمنوا منکم وعملو الصلحت لیستخلفنہم فی الارض" یعنی اگر لوگوں نے مقررہ اصول حیات و ترقی کا یقین کرلیا اور انھوں نے اس پر کاربند ہوکر سعی و کوشش کی تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنادیں گے۔ کرۂ ارض کا وارث کردیں گے اور وہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے زبردست اقتدار و حکومت کے مستحق قرار پائیں گے۔

یہ ہے اصل روح اس تعلیم کی جو مذہب اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی اور دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے زیادہ عملی تعلیم نہ اس سے قبل کسی مذہب نے دی اور نہ آیندہ اس میں کسی اضافہ کی گنجایش ہے۔

اسلام کی اولین شرط توحید ہے، لیکن چونکہ عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے مختصراً اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آپ جس مولوی سے پوچھئے گا کہ توحید کسے کہتے ہیں وہ یہی جواب دے گا کہ خدا کو ایک ماننا توحید ہے۔ حالانکہ اس مفہوم کی غلطی اسی سے ظاہر ہے کہ جب خدا کو زمان و مکان سے بے نیاز مانا جاتا ہے تو اس کو ایک کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جبکہ ایک کے مفہوم میں زمان و مکان دونوں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کا مفہوم لوگوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ وہ مفہوم ہے جو لفظ کُل سے ظاہر کیا جاسکتا ہے، اسی لئے میرے نزدیک

خدا کا کوئی موزوں و مناسب نام ہو سکتا ہے تو وہ صرف کُل ہے اور اسی کو اس کا اسم اعظم قرار دینا چاہئے۔ یہ مفہوم خدا کا ایسا ہے جس میں نہ کبھی شائبۂ شرک پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ صورتیں جو عام طور پر شرک سمجھی جاتی ہیں داخلِ شرک ہو سکتی ہیں۔

خدا کو کُل سمجھنا، یعنی اس کو تمام کائنات کا محیط اعظم، دائرۂ کونین کا مرکز حقیقی موجودات کا خالق اصلی، عالم اسباب کا علۃ العلل قرار دینا یہی مفہوم ہے اسلام کی توحید کا اور یہی مدعا ہے صوفیہ کی وحدت الوجود کا لیکن فرق یہ ہے کہ صوفیہ نے وحدت الوجود کو خوارق عادات اور کرامات کی بنیاد قرار دے کر اپنے آپ کو عضوِ بیکار بنا لیا اور سائنس نے اس کُل کو مظاہر جزئیات سمجھنے کی کوشش کی اور صحیح معنے میں علم "خلیفۃ اللّٰہی" بلند کیا۔

میں ہرگز یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ اگر کوئی شخص بُت پرستی کرتا ہے تو وہ شرک میں مبتلا ہے، کیونکہ بُت پرستی حقیقتاً اسی کُل کے مختلف مظاہر و آثار کا مطالعہ ہے اور دُنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ تمام کاموں کا انحصار حقیقتاً انھیں پتّھر کی مورتوں پر ہے۔

خدا کے مفہوم کی تعیین میں سب سے بڑی غلطی ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ ہوئی ہے کہ اس کو دُنیا کے انسانی بادشاہ کی طرح پیش کیا گیا جو خوش بھی ہو سکتا ہے، اور برہم بھی حالانکہ ان دونوں کا اطلاق اس پر نہیں

ہوسکتا، اگر کوئی شخص عمر بھر خدا کو گالیاں دے تو وہ برہم ہو کر اپنے قانون کو نہیں بدل سکتا اور اگر کوئی ہر وقت سجدہ ہی میں پڑا رہے تو خوش ہو کر اس کی سعی سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کوئی قوم بُتوں کے سامنے جھکتی ہے، متعدد خداؤں کی قایل ہے تو وہ صرف اسی وجہ سے عنداللہ مغضوب ہے۔ درست نہیں۔ البتہ اگر اس کی بُت پرستی یا شرک اسے اوہام باطلہ میں مبتلا کر کے اس نصب العین سے ہٹا دینے والے ہیں، جو خدا کو واحد یا کُل ماننے کی حالت میں سعی و عمل، کاوش و جستجو، اقدام و ترقی کی صورت میں رونما ہوتا ہے تو بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت اس سے برہم ہے اور اس کی برہمی یہی ہے کہ ہم دُنیا میں ذلیل و حقیر ہیں، اور غلامی و اسیری کی زندگی بسر کریں۔

"انتم الاعلون ان کنتم مومنین" (تم کو بلند مرتبہ والا ہونا چاہئے اگر تم مومن ہو) اسلام کی تعلیم ہے اور یہیں سے ایمان کی حقیقت واضح ہوتی ہے، اور اس توحید کی جو ایمان کی بنیاد ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص تمام عمر خدا کے ایک ہونے کا وظیفہ رٹتا رہے، لیکن وہ اس کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہوئے، سوا مسجد میں اذان دینے کے اور کچھ نہ کرے تو کیا ایسے انسان کو ان مومنین میں شامل کر سکتے ہیں، جن کے ایمان کا نتیجہ لازمی اقتدار و مرتبہ بلند بتایا گیا ہے۔

اس لئے اگر ایمان و اسلام کی بنیاد توحید ہے، تو اس توحید کے

معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا کو ایک سمجھا جائے بلکہ اس کو محیط کُل باور کیا جائے اُصول فطرت کا مطالعہ کیا جائے۔ عالم اسباب پر نگاہ ڈالی جائے اجتہاد عمل کو معمول بنایا جائے۔ دماغی و ذہنی قوتوں سے کام لیا جائے اور کائنات کو مسخر کر لیا جائے، چنانچہ صراحتہً بیان ہوتا ہے کہ:۔

"وسخر لکم مافی السمٰوات ومافی الارض جمیعًا
منہ ان فی ذالک لآیات لقوم تیفکرون"

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمھارے تابع فرمان ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ تم غور و فکر، تامل و تدبر، سعی و کاوش سے کام لو، پھر دیکھو کہ کیا بحر و بر کی تسخیر انسان کے لئے ناممکن ہے، کیا جبال و انہار پر آج انسانی اقتدار نہیں پایا جاتا، پانی، ہوا، آگ، بجلی، بادل، فضا، روشنی، حرارت، ہوا کے طیور، زمین کے چوپائے، پہاڑوں کے معدنیات، پانی کے حیوانات الغرض دُنیا میں کوئی چیز، کوئی کیفیت کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو انسان کے اقتدار سے باہر ہو، لیکن کیا دُنیا کا کوئی مذہب ایسا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے انسان کی ان جملہ ذہنی ترقیوں کا درس اسی طرح کھُلے ہوئے الفاظ میں دیا ہے۔ جیسا قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسلام نام ہو صرف قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کا، اس لئے ہر وہ جماعت جو اسکی عامل ہے۔ مسلمان کہلائے گی خواہ وہ مسیح کی اولاد میں ہو یا رام و لچھمن کی ذریات میں سے اور جو اس پر عامل نہیں ہے، وہ یقینًا کافر، مشرک اور

غیر مسلم کہلائے گی، خواہ وہ آل فاطمہ ہی سے کیوں نہ نسبت رکھے، یہ ہے قرآن کا فیصلۂ آخر جو اس نے ایک مسلم کافر کی تفریق و امتیاز کے متعلق سب کو سُنا دیا ہے اور جس میں کبھی کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوسکتی، خواہ وہ انسانی ذہن و تمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرجائے۔

آپ تمام قرآن کو دیکھ ڈالئے، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ کی چھان بین کر لیجئے۔ ہر جگہ تعلیم کی یہی عمومیت درس کا یہی احاطۂ کامل اور تہذیب عمل کی یہی ہمہ گیری نظر آئے گی عبادات کی تعلیم، صلاح و تقویٰ کا درس، غور و تامل کی ہدایت، تفکر و تدبر کی تاکید، الغرض ہر ارشاد اسی ایک اُصول ترقی پر منحصر ہے، اور کسی جگہ رسمی، ظاہری بے معنی طاعت کو مقصود قرار نہیں دیا گیا۔ نماز میں بھی اسی وحدت عمل کو مقصود قرار دیا گیا۔ نماز میں بھی اسی وحدت عمل کا نظارہ ہے۔ روزہ میں بھی اسی احساس انسانیت کی تعلیم ہے زکوٰۃ میں بھی وہی تعاون و ہمدردی کا سبق ہے، حج میں بھی وحدت عمل مقصود ہے، اور جہاد نفس و مال اسی محنت و جفاکشی، اس ایثار و قربانی کی تعلیم ہے جو اساس ارتقاء اور بنیاد اخلاق ہے۔

اس سے قبل ہم بیان کرچکے ہیں کہ سب سے زیادہ صدمہ مذاہب کو جس چیز سے پہونچا وہ ڈاروِن کا اُصول ارتقاء (EVOLUTION) تھا لیکن اسلام اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب سے ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ

سب سے پہلے جس نے اس مسئلہ کی حقیقت پر گفتگو کی وہ اسلام ہی کا پیرو ابونصر محمد فارابی تھا۔ اور ڈاروِن سے بہت قبل ابن سینا، ابن باجہ اور ابن مسکویہ (حکماء اسلام) ہی تھے جنھوں نے اُصول ارتقاء کو بڑی حد تک مدون کیا۔

ممکن ہے آج مولوی اس کو بھی کفر و الحاد کہے اور قدیم حکماء اسلام کو کافر و ملحد کے خطاب سے یاد کرے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ قرآن میں خود اس مسئلہ کے مختلف مدارج و اُصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ آج چونکہ ڈاروِن کے نام سے یہ نظریہ منسوب کیا جاتا ہے اس لئے مسلمانوں کو اسکے قبول کرنے میں پس و پیش ہوتا ہے، علماء کرام اس کی تضحیک کرتے ہیں، حالانکہ اگر نظر وسیع ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے دریافت کا فخر بھی فرزندانِ اسلام ہی کو حاصل ہے، اور قرآن میں خود جابجا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے!۔

۱۔ "ربنا الذی اعطے کل شئ خلقہ ثم ہدی"

(میرا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت و جبلت عطا کی اور پھر ترقی کی طرف مایل کیا)

کیا ڈاروِن کے اُصول انواع کا کوئی دوسرا مفہوم ہے۔

۲۔ "لیس للانسان الا ماسعیٰ۔ رفع بعضکم فوق درجات"۔

کیا تنازع للبقا اور صلاحیت کے لحاظ سے، مختلف درجات قیام

کی تعیین اور بقاء اصلح کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے، کیا کلام مجید میں مومنین، مسلمین، صالحین، قانتین وغیرہ کے جو سیکڑوں الفاظ آئے ہیں وہ افراد اصلح کو ظاہر نہیں کرتے اور کیا (Survival of the fittest) کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

۳- "ہوالذی انشاءکم من نفس واحدۃ فمستقر و مستودع"

کیا موجودہ علم الحیات کا یہ مسئلہ کہ آفرینش کا سلسلہ صرف ایک نفس سے ہوا ہے جسے (Proton) بھی کہتے ہیں، کوئی دوسری چیز ہے کیا لفظ مستقر سلسلۂ آفرینش کے مختلف مدارج کو ظاہر نہیں کرتا اور کیا مستودع سے سلسلۂ آفرینش کی آخری مکمل کڑی (انسان) کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

الغرض نظریۂ ارتقاء کا کوئی اصول ایسا نہیں ہے جس کی طرف قرآن نے رہبری نہ کی ہو اور اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علم و حکمت کے اس محکم ترین نظریہ کا ہم آہنگ نظر آتا ہے اور پھر ایک اسی مسئلہ پر کیا موقوف ہے، تمام وہ مسائل جو اساسی طور پر کسی نہ کسی نہج سے مذہب کے متصادم ہو سکتے ہیں۔ سب کے لئے قرآن میں بہترین اشارات پائے جاتے ہیں اور ایسے مستحکم و مضبوط کہ ذہن انسانی اپنے بلند ترین نقطۂ عروج پر پہونچنے کے بعد بھی ان میں جنبش پیدا نہیں کر سکتا۔

فلکیات میں بطلیموس اور ارسطاطالیسی نظام کی تردید سب سے پہلے جس نے کی وہ قرآن ہی تھا کہ اس نے ان اجرام کو "کل فی فلک یسبحون" کہکر یہ بتایا کہ یہ سب کے سب اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں اس کے بعد کوپرنیکی نظام قایم ہوا جس میں غلطی سے سورج کو اپنی جگہ ساکن مانا گیا، پھر ایک زمانہ کے بعد ہرشل نے گزشتہ صدی میں ثابت کیا کہ آفتاب مع اپنے تمام سیارگاں کے خود کسی اور چیز کا طواف کر رہا ہے حالانکہ قرآن اس سے بہت قبل اس حقیقت کا اظہار کرچکا ہے کہ "والشمس تجری لمستقر لہا" اسی طرح علوم جدیدہ کے اور بہت سے اساسی مسایل ایسے ہیں جو تعلیمات قرآنی کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں اور اس لئے اگر یہ دعوے کیا جائے کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو ہر زمانہ کی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے تو یہ دعوے غالباً غلط نہ ہوگا۔

اب رہ گئی اس کی اخلاقی تعلیم جو حقیقتاً اساس تہذیب و تمدن ہی سو اس کے متعلق غالباً مخالفین کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اسلام سے زیادہ عملی درس دینے والا، اور زندگی کو یکسر اضطراب عمل ثابت کرنے والا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد نہ خرافیات پر ہے، نہ صنمیات پر، نہ جس کا انحصار اساطیر الاولین کے ماننے پر ہے، نہ کسی مخصوص رسم و رواج اور طریق عبادت و نمایش پر، اس نے صرف ایک تعلیم دی ہے کہ دنیا میں

آئے ہو تو کائنات پر غور کرو، مظاہر قدرت کا مطالعہ کر کے اپنی ان قوتوں کو بروئے کار لاؤ جو تمہارے اندر ودیعت کر دی گئی ہیں، نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت پیدا کرو، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی کرو اور اپنی سعی و کوشش سے دُنیا کو اپنے لئے فردوس بنالو۔ پھر جو شخص اس اُصول پر کاربند ہے وہ حقیقتاً اسلام ہی کے اُصول پر کاربند کہلائے گا خواہ کسی رنگ و نسل کا ہو اور جو اس پر عامل نہیں ہے اس کو مسلمان کہلائے جانے کا کوئی حق حاصل نہیں، خواہ حطیم کعبہ ہی کے اندر اس کی ماں نے کیوں نہ اس کو جنا ہو۔

نماز اُصولاً درس اجتماع ہے، زکوٰۃ اُصولاً جذبۂ تعاون ہے، روزہ اُصولاً حسیات لطیف کی بیداری ہے، اور حج اخوت و انسانیت کا احساس ہے وسیع پیمانہ پر، اس لئے اگر قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنے کے لئے ان کے لئے مخصوص قواعد مرتب کئے جائیں تو تعلیم الٰہی کے منافی نہیں ہوسکتا لیکن چونکہ یہ تمام قواعد و ضوابط صرف سوسائٹی سے متعلق ہیں اور انسانی معاشرت کو اسلوب بلند پہ لانے کے لئے ہمیشہ ایسے قوانین مرتب کئے جاتے ہیں جو جماعت کے افراد میں باہم انتشار خیال و اختلاف اعمال کے امکانات کو دور کر کے ہیئت اجتماعی کو متاثر نہ ہونے دیں، اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ آج کا بنایا ہوا قانون کل اور کل کا بنایا ہوا پرسوں کام نہیں دے سکتا۔ اور اس میں زمانہ و ملک کے لحاظ سے تبدیلی کا

ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کو ہمارے علمائے کرام نے نہیں سمجھا، اور یہی مسئلہ میرے ان کے درمیان استخوان جنگ بنا ہوا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی فقہ ایک چیز ہے میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے وہ کہتے ہیں کہ اسلام نام ہے صرف ایک مخصوص طریقہ سے عبادت کرنے کا، مقررہ قواعد کے تحت روزہ رکھنے کا، تعین مقدار کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ طریقے اور قاعدے اصل چیز نہیں بلکہ ہر زمانہ کے لحاظ سے بدل جانے کی چیزیں ہیں اس لئے نہ ان پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ان کو مذہب میں داخل کرنے کی، بلکہ اگر آج ترقی تمدن ضروریات معاشرت، اقتضاءِ مشاغل یا کسی اور مصلحت کی بناء پر جس کی رعایت ہماری دینوی فلاح کے لئے ضروری ہے، فقہ کو بدل ڈالنا اُصول عبادت میں تغیر و تبدل کر دینا۔ ضابطۂ معاشرت میں ترمیم و تنسیخ کر دینا، مناسب ہو تو ایسا کر دینا چاہئے اور یہی اولین فرض ہے ایک ذی شعور عالم دین کا۔ ایک صاحب فہم اخلاقی رہبر کا۔ اور ہر اس ہادی مذہب کا جو اسلام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا تحریف ہوگی، اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تو دعوے بالکل غلط ہوگا، کیونکہ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو آج حنبلی فقہ، حنفی فقہ، شافعی فقہ کی کیوں تفریق ہوتی، اشاعرہ و معتزلہ کی جماعتیں کیونکر پیدا ہوتیں، قرون اولیٰ میں تاویلات کا دروازہ کیوں کھلتا اجتہادات و

قیاسات میں کیوں اختلاف ہوتا اور اقوال آئمہ و مجتہدین میں اس قدر اُصولی اختلاف کیسے پیدا ہوتا کہ آج یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی دشوار ہے کہ رسول اللہ واقعی ہاتھ باندھکر نماز پڑھا کرتے تھے یا ہاتھ کھول کر۔

ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد وہ مسائل نہیں ہوا کرتے جن میں لوگوں کے اختلاف کو گوارا کیا جا سکتا ہے، بلکہ اساس مذہب صرف وہ مقصود ہوتا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، پھر مذہب اسلام کا اساسی اصول صرف ایک ہے، جسے قرآن میں ہر جگہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دُنیا میں اخوت عامہ و انسانیت کے رشتہ کو مضبوط کرو اور ہر ممکن ترقی کے حصول پر آمادہ ہو جاؤ۔ اگر اس سے کسی کو اختلاف ہو تو بیشک ہم کہیں گے کہ وہ اسلام سے خارج ہے انسانیت سے علحدہ ہے، لیکن جب تک کوئی شخص اس اصول تعلیم کو مان رہا ہے اور اس پر عامل ہے اس وقت تک کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اسے دائرۂ مذہب سے خارج کردے، خواہ وہ نماز کا عادی ہو یا نہ ہو، روزہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، یہ درست ہے۔ کہ قرآن میں ان شعائر اسلامی کی پابندی کا ذکر موجود ہے لیکن صرف ایک مختص الوقت و مختص المقام قانون کی حیثیت سے اور آج اگر ضرورت ہو تو ان کو بدلا جا سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ کلام مجید کی عظمت کو اس سے صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہو۔

حقیقت سے ہٹ کر فروع کو اصل قرار دینے کی داستان بہت طویل ہے، اگر اس کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسکی بنیاد عہد سعادت کے ختم ہوتے ہی پڑ گئی تھی، لیکن بعد کو اس میں اور اضافے ہوتے گئے گمراہیوں میں اشتداد ہوتا رہا، صراطِ مستقیم سے ہٹنے کے بعد زیادہ پیچ در پیچ راہوں میں اُلجھتے گئے۔ یہاں تک کہ آج اسلام کا مفہوم ہی بالکل بدل گیا اور وہ انسانیت کی سطح بلند سے گر کر رسم و رواج اور اوہام باطلہ، عقائد سخیفہ، مفروضات ردیہ، اور مزعومات کاذبہ کا مجموعہ ہو کر رہ گیا اور چونکہ گمراہی شدید ہے، ضلالت سخت ہے، اور اسلام کا درس اولین دماغ سے بالکل محو ہو چکا ہے۔ اس لئے اب جو صحیح بات بتائی جاتی ہے تو اس کو بھی غلط سمجھا جاتا ہے اور عرصہ تک تاریکی میں رہنے کی وجہ سے روشنی سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔

اسلام و ایمان نام تھا صرف اتحاد امت کا، نفسی و مالی جہاد کا، سعی و عمل کا، مکارم اخلاق کا، سیروا فی الارض کا اور کفر کہتے تھے صرف افتراق امت کو، جہاد سے جی چرانے کو، محنت و کوشش سے منحرف ہونے کو، اصول اخلاق سے ہٹ جانے اور پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ جانے کو۔ لیکن اب اسلام ہے نام صرف تسبیح و عمامہ کا، جبہ و دستار کا، رسمی نماز ادا کر لینے کا، اور عمر مثلاً اگر رشتا و تقلید اُحرم کے

طواف کر لینے کا۔ اسی طرح کُفر کا مفہوم یہاں تک وسیع ہو گیا ہے اگر آج میں کسی مولوی سے فلسفۂ عبودیت پر بحث کر کے نماز کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں، تو وہ مجھے کافر، ملحد، فاسق و فاجر کہکر نکال دیتا ہے۔

بہر حال دُنیا کو ایک نظام کی ضرورت یقیناً ہے، کیونکہ جامعۂ بشری اس کا محتاج ہے، اخلاق کی تعلیم کے لئے کسی نہ کسی ایسی بنیاد کی ضرورت ہے جو سوسائٹی کے قوانین لوگوں پر عاید کر سکے وہ نظام اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اسلام ہے جس کی آغوش ساری دُنیا کے لئے کُھلی ہوئی ہے اور جس کی تعلیمات فطری ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد غالبًا یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ دُنیا میں یا جوجی قوت کون سی ہو سکتی ہے۔ وہ جو اپنی تنگ نظری سے خود اپنے افراد کو بھی علحدہ کر رہی ہے۔ یا وہ جو ساری دُنیا کو دعوت عمل دے کر ایک مرکز پر ایک غرض مشترک کے ساتھ جمع کرنا چاہتی ہے۔

نیاز

ناشر: نگار بک ایجنسی لکھنؤ

طابع: مختار پرنٹنگ ورکس لکھنؤ

سنہ ۴۴ء

نادرہ

کتب بینی
سب سے بڑی
عبادت ہے اور
ماحول سب سے
بڑا معلم

24.6.70

9/6